ماسکو ماسکو

کے اشرف

ضابطہ

ISBN: 976-1-4507-3838-5

سفر نامہ :ماسکوماسکو

مصنف :کے اشرف

دیدہ ریزی:راشد اشرف

سال اشاعت:2012

تعداد :500

سرورق:چارلس کینٹز

مطبع :سی ڈبلیو پرنٹرز

قیمت:10یو ایس ڈالرز

سی ڈبلیو پرنٹرز،1375یونیورسٹی ایونیو،برکلے، کیلیفورنیا

انتساب

رُوسی مزدوروں اور کسانوں کے نام

اظہارِ تشکر

کسی بھی سفر نامے میں بظاہر ایک سیاح اپنے سفر کے دوران حالات و واقعات کی تفصیل رقم کرنے کی بجائے اُن جگہوں کے بارے میں اپنے قارئین کو بتاتا جو وہ اپنی سیاحت کے دوران دیکھتا ہے۔ اِس کے علاوہ اُن دلچسپ لوگوں کا ذکر کرتا ہے اِس سفر کے دوران جن سے اُس کا سابقہ پڑتا ہے۔ اگر اس سفر میں اُس کے ساتھ کچھ ہمسفر بھی ہوں تو وہ بھی اس سفر نامے کی جزئیات و تفصیلات کا حصہ بنتے ہیں۔

سفر رُوس میں علی میرے ساتھ امریکہ سے رُوس گیا۔ ماسکو میں پاول ہمارا میزبان تھا۔ وہ رُوس میں علی کا کلاس فیلو ہے۔ دوران تعلیم علی اور پاول میں قائم ہونے والا رشتہ عمر بھر کی دوستی میں تبدیل ہو گیا۔ امریکہ ہجرت کرنے کے بعد علی جب بھی رُوس جاتا ہے وہ پاول کے ہاں قیام کرتا ہے اور پاول جب بھی امریکہ آتا ہے وہ علی کے ہاں ٹھہرتا ہے۔

اِس سفر کے دوران علی اور پاول نے جس طرح میرا ساتھ دیا اِس کے لئے میں اُن دونوں کا تہہِ دل سے ممنون ہوں۔ اگر اُن دونوں کا ساتھ نہ ہوتا تو شاید میرا سفر رُوس اتنا مفید، آرام دہ اور دلچسپ نہ ہوتا۔

اِس سفر نامہ کے مطالعہ کے دوران آپ کو بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ کس طرح علی اور پاول اِس سفر میں ہر لمحہ میرے ہمقدم رہے۔ مجھے معلوم ہے جب آپ یہ سفر نامہ ختم کریں گے تو آپ بھی میرے ساتھ اُن دونوں کے اِسی طرح شکر گزار ہوں گے جیسے میں ہوں۔

اِس کے علاوہ میں علی کی بیگم اور بیٹی کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے محض میری خاطر علی کو میرے ساتھ رُوس جانے کی اجازت دی اور ایک ہفتہ تک اُس کے بغیر امریکہ میں اپنے روز مرّہ کے اُمور تنہا سر انجام دیئے۔

آخر میں میں فیصل کا بھی شکریہ ادا کرنا پسند کروں گا جس نے ماسکو میں پورا ایک دن ہمارے ساتھ گزارا اور ہمیں کئی اہم جگہیں دکھائیں۔

اس کے علاوہ میں ممنون ہوں اپنے قارئین یعنی آپ کا جن کی حوصلہ افزائی ہمیشہ مجھے نئی ادبی مہمات پر آمادہ رکھتی ہے۔ یقین کریں آپ کی حوصلہ افزائی کے بغیر یہ سب ممکن نہ ہوتا۔ اُمید کرتا ہوں کہ آپ اِسی طرح اپنے خطوط اور اِی میلز کے ذریعے میری حوصلہ افزائی فرماتے رہیں گے۔

پیش لفظ

مجھے زندگی میں کئی ممالک میں جانے کا اتفاق ہوا لیکن رُوس کی سیاحت کا تجربہ کئی حوالوں سے میرے لئے بہت اہم تھا۔ ریاستوں کے سیاسی، سماجی اور معاشی امور سے دلچسپی رکھنے کی وجہ سے میں چاہتا تھا کہ بیس سال قبل دنیا کی دو سپر پاوروں میں سے ایک کے اسٹیٹس سے محرم ہونے کے بعد رُوس میں سیاسی، سماجی اور معاشی تبدیلیوں کا جائزہ لوں۔ لیکن یہ جائزہ ایک اسکالر کا نہ ہو جو چیزوں کو اِس لئے دیکھتا ہے کہ اُن کا تجزیہ کر کے اُس سے کوئی نتائج اخذ کرے بلکہ ایک سیاح کا ہو چیزوں پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر اُنہیں اپنے قارئین کے حوالے کر دیتا ہے کہ وہ چاہیں تو تبدیلی کے اِس عمل سے لطف اندوز ہوں یا اسے بھی دنیا کے باقی ممالک میں جاری رہنے والی زندگی کی ایک رو سمجھ کر آگے بڑھ جائیں۔

خوش قسمتی سے اپنے اس سفر رُوس کے دوران مجھے اس بات کے وافر مواقع میسر آئے۔ میں نے بعد از سوویت یونین رُوس میں رونما ہونے والی سماجی اور معاشی تبدیلیوں کو قریب سے دیکھا اور اُنہیں سمجھنے کی کوشش کی۔ اس سفر نامے میں آپ کو ان تبدیلیوں سے لپٹی میری سوچ کے اتار چڑھاؤ کئی جگہ دکھائی دیں گے۔

مجھے لگا کہ رُوسی سوویت یونین کی تحلیل کے بارے میں ملی جلی سوچ رکھتے ہیں۔ کچھ لوگ خوش اور کچھ ناخوش ہیں۔ یہ ردِّ عمل کسی ایک جنریشن تک محدود نہیں ہے۔ یہ فکری دوری پرانی اور نئی نسل کے رُوسیوں میں یکساں دکھائی دیتی ہے۔

میرا مشاہدہ کہتا ہے کہ رُوسی سماج اور نظام فی الحال ایک ٹرانزیشن کے عمل سے گزر رہا ہے۔ اِس وقت اِس میں وہ سب کمزوریاں اور خرابیاں موجود ہیں جو ٹرانزیشن میں سے گزرتے ہوئے کسی سماج میں پائی

جاتی ہیں۔ چونکہ اس کے نیچے سوویت یونین کا فراہم کردہ ایک مضبوط انفراسٹرکچر موجود ہے اس لئے روس ان کمزوریوں اور خرابیوں پر آئندہ ایک دو دہائیوں میں قابو پانے پر کامیاب ہو جائے گا اس لئے اِس کے ایک صحت منداور مضبوط ملک کے طور پر دوبارہ ابھرنے کے کافی امکانات موجود ہیں۔

یہ سفرنامہ پڑھنے کے بعد آپ کے تاثرات کا مجھے شدّت سے انتظار رہے گا۔ ازراہِ کرم ضرور لکھئے کہ آپ کو یہ سفرنامہ کیسا لگا۔

28اگست2012

کے اشرف

1375یونیورسٹی ایونیو، برکلے، کیلیفورنیا94702

یو ایس اے

kashraf@ix.netcom.com

رُوس کا موجودہ نقشہ

رُوس کی طرف روانگی

بہت عرصہ سے خواہش تھی کہ روس جاؤں۔ اُن گلیوں، محلوں اور سڑکوں پر گھوموں جہاں بیسویں صدی میں مزدوروں اور کسانوں نے ایک طویل جدوجہد کے بعد ایک جنت تعمیر کی تھی۔

سوویت یونین کی موجودگی میں تو یہ خواہش پوری نہ ہو سکی لیکن اکیسویں صدی کے آغاز میں جب کہ مزدوروں اور کسانوں کی یہ جنت دوبارہ روسی فیڈریشن میں تبدیل ہو کر سرمایہ دارانہ دنیا کا حصہ بن چکی ہے رُوس جانے کا اتفاق ہوا ہے تو بھی میرا دل اس سیاحتی دورے کی وجہ سے جوش و جذبہ سے معمور ہے۔

سنا ہے کہ اب رُوس ویسا نہیں رہا جیسا سوویت یونین کے دنوں میں تھا۔ مکمل سماجی کنٹرول کی وجہ سے سوویت یونین کے زمانے میں ماسکو میں جرائم تقریباً نہ ہونے کے برابر تھے۔

اب تو سنا ہے کہ ماسکو جرائم پیشہ لوگوں کی جنت ہے۔ کئی دوستوں نے منع کیا ہے کہ میں ماسکو جانے کے خیال سے باز آ جاؤں۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ جس ملک کو دیکھنے کی ساری عمر خواہش کی اب ڈھلتی عمر میں ہی سہی اگر اُسے دیکھنے کا موقع مل رہا ہے تو کیسے وہاں جانے کا ارادہ ترک کر دوں۔ اِس مصمم ارادے کی وجہ سے سفر رُوس کے لئے جن لوازمات کی ضرورت تھی وہ میں کافی عرصہ سے پورا کر چکا ہوں۔

رُوس جانے کے لئے ائیر ٹکٹ تو میں نے تین چار ماہ پہلے ہی خرید لی تھی۔ بہت اچھی فلائٹ ملی تھی۔ سان فرانسسکو سے واشنگٹن اور واشنگٹن سے ماسکو۔ یعنی امریکی دارُالحکومت سے اُڑ کر سیدھے رُوسی دارُالحکومت میں۔

میں کوشش کروں گا کہ اِس سفر میں آپ کو بھی اپنے ساتھ رکھوں۔ تا کہ سوویت یونین ٹوٹنے کے دو دہائیوں بعد والے رُوس میں جو کچھ میں دیکھوں وہ آپ کو بھی دکھاؤں۔

میں کوشش کروں گا کہ اِس سفر میں آپ کو اپنی غیر ضروری سفری تفصیلات سے بور نہ کروں لیکن سفر نامہ میں سفری تفصیلات تو آئیں گی۔ ایئر لائنوں کی تفصیل بتانے سے گریز کروں لیکن اِس سفر میں ایئر لائنز کا سفر بھی تو شامل ہے۔ خواہش تو یہ تھی کہ اس سفر نامے میں سان فرانسسکو سے واشنگٹن اور واشنگٹن سے ماسکو تک کے سفر کی تفصیلات میں جانے کی بجائے اس کہانی کا آغاز اپنی ڈوموڈیڈیوو ایئر پورٹ پر آمد سے کروں گا۔

لیکن مجھے لگتا ہے کہ کچھ واقعات کی وجہ سے اِس اسٹریجی پر مکمل طور پر عمل کرنا ممکن نہیں۔ کیوں کہ بین الاقوامی سفر، اور وہ بھی نئ اور اَن دیکھی سرزمینوں کا سفر، اپنے ساتھ ہمیشہ کچھ نہ کچھ نئے چیلنجز لے کے آتا ہے۔ اِس لئے نہ چاہتے ہوئے بھی سان فرانسسکو سے واشنگٹن اور واشنگٹن سے ماسکو تک کے سفر میں پیش آنے والے ایک دو واقعات کا ذکر کرنا ضروری ہے۔

ایک واقعہ تو سان فرانسسکو ایئر پورٹ پر ہی پیش آیا۔ ہوا یوں کہ جیسے ہی میں جہاز پکڑنے کے لئے ایئر پورٹ پہنچا میں نے ایئر لائن کے کاونٹر پر جا کر بورڈنگ پاس حاصل کئے۔ بورڈنگ پاس جاری کرنے سے پہلے کاونٹر کلرک نے مجھے پوچھا کہ کیا میں نے رُوس کا ویزا حاصل کیا ہے۔ میں نے اثبات میں جواب دیا اور پاسپورٹ پر رُوسی ویزے کا صفحہ کھول کر خاتون کو دکھایا۔ اُس نے رُوسی زبان میں لکھے ویزے کے اندراج پڑھنے کی کوشش کی لیکن کافی کوشش کے باوجود وہ ویزا کے مندرجات پڑھنے میں ناکام رہی۔ کیونکہ رُوسی زبان کے اپنے حروف ابجدی ہیں جو کہ انگریزی سے مختلف ہیں اور اُنہیں پڑھنے کے لئے اُنہیں سیکھنا پڑتا ہے اور پڑھنے کی مہارت حاصل کرنا پڑتی ہے۔ اُس کی پریشانی بھانپتے ہوئے میں نے اپنی

جیب سے اسپانسر شپ کے کاغذات نکال کر اُس کے حوالے کئے تو اس کی جان میں جان آئی۔ کیونکہ اسپانسر شپ لیٹر میں انگریزی میں وہ سب انفارمیشن موجود تھی جو اُسے چاہئے تھی۔ اسپانسر شپ لیٹر پڑھ کر اس نے جہاز پر سوار ہونے کے لئے مجھے بورڈنگ کارڈ جاری کر دیئے۔

بورڈنگ کارڈ سان فرانسسکو سے واشنگٹن اور واشنگٹن سے ماسکو تک کے تھے۔ میں نے جلدی سے بورڈنگ کارڈ پکڑ کر پڑھے بغیر شرٹ کی جیب میں ڈالے اور سیکورٹی گیٹ کی طرف چل پڑا۔

سیکورٹی گیٹ پر مسافروں کی ایک طویل قطار سیکورٹی چیک کے لئے منتظر تھی۔ میں بھی حسبِ معمول اعتماد اور سکون کے ساتھ قطار کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا۔ غیر معمولی رش کے باوجود سیکورٹی گیٹ پر قطار آہستہ آہستہ حرکت کر رہی تھی۔

سیکورٹی افسر تک پہنچنے سے پہلے میں نے اپنا پاسپورٹ اور بورڈنگ کارڈ ایک ساتھ ہاتھ میں پکڑ لئے تاکہ وقت ضائع ہونے سے بچ جائے۔ باری آنے پر جب میں نے ہاتھ میں پکڑے پاسپورٹ اور بورڈنگ کارڈ سیکورٹی افسر کے حوالے کئے تو اُس نے مجھے بورڈنگ کارڈ واپس کرتے ہوئے مجھ سے میرے بورڈنگ کارڈ ز کے بارے میں پوچھا۔ تب میں نے بورڈنگ کارڈوں پر نظر ڈالی تو وہ میرے نہیں کسی مسٹر واٹسن کے بورڈنگ کارڈ تھے۔

کاونٹر کلرک نے بظاہر کسی مسٹر واٹسن کے بورڈنگ کارڈ مجھے تھما دئے تھے اور میں بھی اُنہیں پڑھے بغیر سیکورٹی لائن میں آن کھڑا ہوا تھا۔ خیر مرتا کیا نہ کرتا جلدی جلدی قدم اُٹھاتا واپس کاونٹر کلرک کے پاس پہنچا۔ مجھے کاؤنٹر پر واپس آتے دیکھتے ہی اُس نے اپنی غلطی کا احساس کر لیا تھا۔ وہ اپنی غلطی پر پشیمان تھی۔ اُس نے غلط بورڈنگ کارڈ تھمانے اور دوبارہ واپس آنے کی زحمت پر مجھ سے معذرت کی۔ شاید مسٹر واٹسن مجھ سے پہلے اُس کے پاس آکر اپنے بورڈنگ کارڈ حاصل کر چکا تھا۔

میں نے اس کا دل رکھنے کے لئے جعلی مسکراہٹ کے ساتھ نئے بورڈنگ کارڈ پکڑے اور اُس کا شکریہ ادا کر کے تیز تیز قدم اُٹھاتا دوبارہ سیکورٹی گیٹ تک پہنچا تو سیکورٹی افسر نے مجھے دوبارہ لائن میں کھڑا ہونے کی بجائے براہِ راست اپنے پاس بلا لیا۔

سیکورٹی سے فارغ ہو کر جہاز کے گیٹ پر پہنچا تو مسافر پہلے سے جہاز پر سوار ہو رہے تھے۔ میں بھی جلدی سے لائن میں کھڑا ہو کر جہاز میں سوار ہو گیا۔

بورڈنگ مکمل ہونے کے بعد جہاز کے دروازے بند ہوئے۔ جہاز ٹیکسی ہو کر آہستہ آہستہ رن وے پر پہنچا اور پھر چند منٹ تک رن وے پر دوڑنے کے بعد ہوا میں پرواز کر گیا۔

سان فرانسسکو کی شفاف فضا میں بلند ہونے کے تھوڑی دیر بعد پائلٹ نے اپنی معمول کی گزارشات میں مسافروں کو بتایا کہ یوں تو ہمارا سارا سفر ہموار اور خوشگوار ہو گا لیکن جہاز کے راستے میں یوٹا میں طوفانِ بادوباراں کی وجہ سے ہمیں واشنگٹن پہنچتے ہوئے معمول سے قدرے زیادہ وقت لگے گا۔

واشنگٹن میں میری دو فلائٹوں کے دوران صرف ایک گھنٹے کا وقفہ تھا۔ پائلٹ سے یہ خبر سن کر مجھے قدرے تشویش ہوئی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری فلائٹ مس ہو۔ کیونکہ اس صورت میں آپ مکمل طور پر ایئر لائن کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں۔ ایسے میں وہ آپ کے ساتھ جو سلوک بھی کریں وہ خوشی یا غمی سے آپ کو قبول کرنا پڑتا ہے دیکھا گیا ہے کہ عام طور پر اِس صورت میں آپ کو جو چوائس دئے جاتے ہیں وہ اتنے خوش آئیند نہیں ہوتے۔

لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ ہمیں پتہ بھی نہ چلا کہ جہاز کب یوٹا کی فضاؤں میں داخل ہوا اور طوفانِ بادوباراں کے باوجود انتہائی ہموار انداز میں پرواز کرتا اِن فضاؤں سے گزر گیا۔ فلائٹ اپنے مقررہ وقت سے صرف پانچ منٹ لیٹ ہوئی جو کہ زیادہ بڑا مسئلہ نہیں تھا۔

جہاز کے زمین پر لینڈ ہوتے ہی پائلٹ نے جہاز میں اعلان کیا کہ واشنگٹن جن لوگوں کی فائنل منزل ہے وہ برائے کرم اپنی سیٹوں پر بیٹھے رہیں اور جن مسافروں کو دوسری فلائٹیں پکڑنا ہیں اُنہیں پہلے جہاز سے اُترنے دیں۔ واشنگٹن میں رُکنے والے مسافروں نے پائلٹ کی اپیل کا احترام کیا اور اُن مسافروں کو پہلے اُترنے دیا جنہیں دوسری فلائٹیں پکڑنا تھیں۔

میں نے جہاز سے نکل کر اپنا بلیک بیری آن کیا تو فون پر کسی نئے پیغام کی لائٹ جل بجھ رہی تھی۔ میں نے پیغام سننے کے لئے کال کی علی کی بیگم ناستیا نے میرے نام پیغام چھوڑ رکھا تھا کہ علی کی فلائٹ موسم کی خرابی کی وجہ سے موخر ہو گئی ہے اور وہ ماسکو والی فلائٹ کی روانگی کے بعد ہی ڈلس ایئر پورٹ پہنچے گا۔ اُس نے اپنے پیغام میں یہ بھی کہا تھا کہ پاول مجھے ریسیو کرنے کے لئے ماسکو ایئر پورٹ پر موجود ہو گا اِس لئے میں اِس فلائٹ سے چلا جاؤں اور علی واشنگٹن پہنچنے کے بعد کوئی دوسری فلائٹ پکڑ کر ماسکو پہنچ جائے گا۔

میں نے صورتِ حال کا جائزہ لینے اور گیٹ پر کھڑی کاؤنٹر کلرک سے اپنے دیگر امکانات کی تفصیل جان کر ناستیا کو کال کی تو وہ ایئر لائن پر خاصی برہم تھی لیکن پھر مجھ سے ساری تفصیل سن کر اور اِس صورتِ حال سے نبٹنے کے لئے میرا پلان جان کر مطمئن ہو گئی۔

گیٹ پر کاؤنٹر کلرک نے کمپوٹر پر پہلے سے دیکھ لیا تھا کہ نیویارک سے علی کی فلائٹ ہماری روانگی سے بیس منٹ بعد آ رہی ہے۔ اُسے یہ بھی اندازہ تھا کہ جہاز لینڈ کرنے کے بعد علی کو اِس گیٹ تک آتے دس منٹ لگ جائیں گے۔ اُس نے کہا کہ وہ اتنی دیر تک پرواز کی روانگی موخر نہیں کر سکتے۔ میں نے اُسے کہا اِس صورت میں اُسے ہم دونوں کو کسی اور فلائٹ پر ماسکو بھجوانا پڑے گا۔

اُس نے کہا اگر ایسا ہے تو وہ ایک گھنٹے بعد براستہ برسلز ماسکو جانے والی فلائٹ پر ہمیں سوار کرا دے گی۔

میں امریکہ کے دارلخلافے واشنگٹن سے اُڑ کر سیدھا رُوس کے دارلخلافے ماسکو جانے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ لیکن علی کی فلائٹ کی تاخیر نے پروگرام کی ترتیب ہی بدل دی تھی۔ اب دونوں دارالخلافوں کے درمیان اُس روز کوئی اور براہِ راست فلائٹ میسر نہیں تھی۔

کاؤنٹر کلرک کی یہ پیشکش خاصی خوش آئیند تھی۔ اب فلائٹ براہِ راست نہیں تھی لیکن پھر بھی ہم اُسی روز چند گھنٹوں کی تاخیر کے ساتھ ماسکو پہنچ رہے تھے۔ جو کہ یقیناً ایک بُری ڈیل نہیں تھی۔

لیکن کاؤنٹر کلرک ہمارے پروگرام میں یہ سب تبدیلی اپنے طور پر نہیں کر سکتی تھی۔ اُسے اِس تبدیلی کی اجازت رکھنے والے کسی کارندے کی مدد درکار تھی۔ گیٹ کی سامنے ہی ایک بزنس کلب تھا۔ اُس نے مجھے بزنس کلب میں کاؤنٹر کلرک کے حوالے کیا، مختصر الفاظ میں میرا مسئلہ بیان کیا اور خود علی کو لینے گیٹ کے کاؤنٹر پر واپس چلی گئی۔

میں نے بزنس کلب کے دروازے میں کھڑے دیکھا جب ماسکو جانے والا جہاز گیٹ سے رَن وے کی طرف حرکت کر رہا تھا علی خراماں خراماں گیٹ کی طرف آ رہا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر گیٹ پر جانے کے بجائے سیدھا میری طرف چلا آیا۔ وہ تاخیر پر تھوڑا پریشان تھا لیکن پھر مجھ سے اگلے پروگرام کی تفصیل سن کر مطمئن ہو گیا۔

اِس داستان کو پڑھتے ہوئے آپ کو یہ اندازہ تو ہو گیا ہو گا کہ اِس سفر میں علی میرا اہم سفر ہے۔ لیکن اِس سے پہلے کہ میں اِس سفر کی داستان آگے بڑھاؤں بہتر ہو گا کہ میں آپ کو علی سے متعارف کراؤں۔ اِس سے آپ کو ایک تو یہ اندازہ ہو جائے گا کہ علی کون ہے اور دوسرے آپ کو یہ بھی پتہ چل جائے گا کہ علی اِس سفر میں میرے ساتھ کیوں رُوس جا رہا ہے۔

علی اور اُس کی بیگم ناستیا سے میری ملاقات چند ماہ پہلے نیویارک میں اپنے ایک دوست کی بیٹی کی شادی میں ہوئی تھی۔ میرے دوست نے علی اور اُس کی بیگم ناستیا سے میرا تعارف کرایا تھا۔

وہ دونوں شادی ہال میں ایک ٹیبل پر چپ چاپ بیٹھے شادی کے ہنگاموں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

دونوں نے مجھے اپنے ٹیبل پر خوش آمدید کہا۔ پہلے علی نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور پھر اُس کی بیگم نے۔

علی اور ناستیا دونوں مجھے پہلی نظر ہی میں اچھے لگے۔ دونوں کو دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ ان خوش نصیبوں میں سے ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اُن کی جوڑیاں آسمانوں پر بنتی ہیں۔

علی پاکستان سے ہے اور اُس کی بیگم رُوس سے۔ علی کے بعد ناستیا نے ہاتھ ملاتے ہوئے مجھے اپنا اصل رُوسی نام استانسیا ولادی کووا بتایا۔ طوالت اور مختلف لسانی نظام سے ہونے کی وجہ سے میرے لئے یہ نام سمجھنا اور یاد رکھنا خاصا مشکل ثابت ہوا۔ ناستیا نے میری مشکل بھانپ لی۔ چنانچہ اُس نے اپنے طویل نام کی بجائے اپنا مختصر رُوسی نام مجھے بتایا: ناستیا۔

ناستیا کہنا اور یاد رکھنا میرے لئے آسان تھا۔ اس لئے میں نے دوبارہ اُس سے اُس کا اصل نام پوچھنے کی جسارت نہ کی۔

ناستیا کے اصل نام سے مجھے کافی عرصہ پہلے کی گئی اپنی ایک ریسرچ یاد آئی۔ ہوا یوں تھا کہ ایک بار میں نے یہ جاننے کی کوشش کی تھی کہ دنیا کی مختلف زبانوں میں سے طویل ترین لفظ کس زبان کا ہے۔

گوگل سے اِس سوال سے کا جواب یہ ملا تھا کہ دنیا کی زبانوں میں سے طویل ترین لفظ رُوسی زبان کا ہے۔ یہ لفظ رُوسی زبان کے تینتیس حروف سے لکھا جاتا ہے۔ اِس وقت وہ لفظ یاد نہیں۔ لیکن اب بھی گوگل کرنے سے شاید آپ کو وہ لفظ مل جائے۔ لیکن آپ کو اب یہ کام خود ہی کرنا ہو گا۔ کیونکہ اگر میں دوبارہ

ڈھونڈ کر وہ لفظ اس سفر نامے میں لکھ بھی دوں تو مجھے یقین ہے کہ میری طرح آپ بھی اِس لفظ کو پڑھ نہیں پائیں گے۔

اِس لئے میں نے بھی ناستیا کا مختصر نام جاننے کو غنیمت جانا اور پھر ہمیشہ جب کبھی اُس کا ذکر آیا یا اُس سے بات ہوئی اُسے اِسی نام سے مخاطب کیا۔

بہر حال ذکر ہو رہا تھا علی اور ناستیا سے پہلی ملاقات کا۔ شادی ہال میں تعارف کے بعد کچھ دیر تک ناستیا سنجیدہ بیٹھی رہی۔ جب کہ میں اور علی گفتگو کرتے رہے۔ رُوس میں علی کی تعلیم اور رُوس میں میری دلچسپی کی وجہ سے ہماری گفتگو کا موضوع بھی رُوس اور وہاں کا سیاسی اور معاشی نظام تھا۔ اِس دوران ناستیا بالکل خاموش بیٹھی رہی۔ شادی کے دھوم دھڑکے میں اُس کی اِس قدر سنجیدگی مجھے کچھ عجیب محسوس ہوئی۔ مجھے اندازہ ہوا اُس کی سنجیدگی کی وجہ شاید دو عام پاکستانیوں کی طرح میری اور علی کی پنجابی زبان میں باہمی گفتگو تھی۔

شاید وہ دخل در معقولات بھی نہیں دینا چاہتی تھی۔ ناستیا کی خاموشی اور بوریت دیکھ کر میں اور علی نے انگریزی میں گفتگو شروع کر دی۔ جیسے ہی میں اور علی نے انگریزی میں گفتگو شروع کی ناستیا نے بھی اپنی خاموشی توڑ ڈالی اور برابر ہماری گفتگو میں حصہ لینے لگی۔ ہمارا موضوع محض رُوس اور رُوسی سیاسی و معاشی نظام سے پھیل کر یورپ، امریکہ اور بین الاقوامی امور تک پھیل گیا۔

ہم چند منٹ میں اِس طرح آپس میں گھل مل گئے جیسے ایک دوسرے کو بہت عرصہ سے جانتے ہوں۔ علی اور ناستیا نے مجھے پوچھا کہ میں کیا کرتا ہوں۔

اُن کے استفسار پر میں نے اُنہیں بتایا کہ میں ایک لکھاری ہوں۔ کئی ناولوں، کہانیوں اور سفر ناموں کا مصنف ہوں۔

میر اجواب سن کر علی اور ناستیا نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے کتابیں کس زبان میں لکھی ہیں۔ میں نے اُنہیں بتایا کہ میری ساری کتابیں اردو زبان میں ہیں۔

اُنہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں انگریزی میں کیوں نہیں لکھتا۔ میں نے جواب دیا کہ میں پاکستان کے عوام کے لئے لکھتا ہوں۔ پاکستان کے عام لوگ انگریزی نہیں اردو پڑھتے ہیں۔ پاکستانی اشرافیہ انگریزی پڑھتی لکھتی اور بولتی ہے لیکن عام لوگ اردو ہی پڑھتے ، لکھتے اور بولتے ہیں۔ اور میری تحریریں اُن ہی کے لئے ہیں۔ میں نے اُنہیں بتایا کہ میرا ایک ناول "شب گزیدہ سحر" سوویت یونین کے بارے میں ہے۔

میں نے اُنہیں یہ بھی بتایا کہ وہ دونوں میرے ناول شب گزیدہ سحر کے مین کردار ہیں۔ شب گزیدہ سحر کا ہیرو لاہور کا رہنے والا ایک پاکستانی نوجوان ہے جبکہ اُس کی بیوی ماسکو کی رہائشی ایک رُوسی لڑکی ہے۔

شب گزیدہ سحر کے کرداروں کے طرح علی بھی لاہور کا رہنے والا ہے اور اُس کی بیوی ناستیا رُوس سے ہے۔

اُنہوں نے مجھے بتایا کہ ناستیا پیدائشی طور پر رُوسی شہری ہے جب کہ علی نے آج کل کے رجحان کے مطابق دیگر تارکینِ وطن کی طرح رُوسی شہریت حاصل کرر کھی ہے۔ اُنہوں نے مجھے بتایا اب اگرچہ وہ دونوں مستقل طور پر امریکہ میں قیام پذیر ہیں لیکن دونوں نے امریکی شہریت حاصل کرنے کے باوجود اپنی رُوسی شہریت ابھی تک قائم رکھی ہے اور وہ اِسے مستقبل قریب میں ترک کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔

علی نے خواہش ظاہر کی کہ وہ میرا ناول "شب گزیدہ سحر" پڑھنا پسند کرے گا۔ میں نے وعدے کے مطابق سان فرانسسکو لوٹتے ہی "شب گزیدہ سحر" کی ایک کاپی علی کو بھجوادی۔ وہ ناول پڑھ کر بہت خوش ہوا اِس طرح ہمارے درمیان ایک مستقل رابطے کی داغ بیل پڑی۔

میں نے علی کو بتایا کہ میں اگست میں رُوس جارہا ہوں۔ علی اور ناستیا بھی اپنی گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے دو ہفتوں کے لئے ماسکو جا رہے تھے۔ اُنہوں نے مجھے دعوت دی کہ میں اگست میں رُوس جانے کا پروگرام تبدیل کرکے اُن کے ساتھ ہی ماسکو جاؤں تو اُنہیں خوشی ہوگی۔ لیکن میرے لئے اگست سے پہلے ماسکو جانا ممکن نہیں تھا۔ کیوں کہ میں کافی عرصہ پہلے یونان جانے کا پروگرام بنا چکا تھا۔

میں یونان کی سیاحت میں بھی اتنی ہی دلچسپی رکھتا تھا جتنی رُوس میں۔ تاہم میں نے علی سے درخواست کی کہ اگر وہ مجھے ماسکو میں کچھ دوستوں سے ملادے جو اس سفر میں مدد گار ثابت ہوسکیں تو میں اُس کا ممنون ہوں گا۔ اِس طرح میں ماسکو کو ذرا بہتر انداز میں دیکھ سکوں گا۔ ماسکو کے در و دیوار کے پیچھے وہ کہانیاں پڑھ اور سُن سکوں گا جو مقامی لوگوں میں کھلے ملے بغیر پڑھنا اور سُننا ممکن نہیں ہوتا۔ میری درخواست سُن کر علی نے اتنی اچھی پیشکش کی کہ میرے لئے اُسے ردّ کرنا ممکن نہ رہا۔

اُس نے مجھے بتایا کہ یوں تو ماسکو میں اُس کے کئی دوست ہیں لیکن اگر میں پسند کروں تو وہ اگست میں دوبارہ میرے ساتھ رُوس جاسکتا ہے۔ اِس سے زیادہ بہتر کوئی صورتِ حال نہیں ہوسکتی تھی۔ چنانچہ اُس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میں نے اُس کی آفر قبول کرلی اور اُسے اپنے ماسکو کے سفر میں اپنا ہمسفر بنانے کا فیصلہ کرلیا۔

پروگرام کے مطابق علی اور ناستیا جون کے دوسرے ہفتے میں رُوس چلے گئے جبکہ میں یونان چلا گیا۔

اب آپ اِس کہانی میں علی کی موجودگی کے بارے میں جان گئے ہیں تو ہم آگے چلتے ہیں۔

یونان سے واپسی کے فوراً بعد میں نے اپنے سفر رُوس کی تیاریاں شروع کر دیں- ویزے وغیرہ کا بندوبست میں پہلے کر چکا تھا۔ ٹکٹ بھی بہت عرصہ پہلے بک ہو چکی تھی۔

میں نے علی کو کال کی تو اُس نے مشورہ دیا کہ میں رمضان کے اختتام تک اپنا پروگرام موّخر کر دوں تو وہ میرے ساتھ واپس ماسکو جا سکتا ہے۔ میں نے کہا اب پروگرام میں تاخیر کا امکان بہت کم ہے۔ اُس نے میرا اارادہ اٹل دیکھا تو اس نے مجھ سے میرے سفر کی تفصیلات لے کر میرے پروگرام کے مطابق اپنا پروگرام ترتیب دے لیا۔

اِس پروگرام کے مطابق میں نے سان فرانسسکو سے تین بجے کے قریب ڈی سی پہنچنا تھا جب کہ علی نے یونائیٹڈ کی ہی فلائٹ پکڑ کر نیویارک سے ساڑھے گیارہ بجے واشنگٹن پہنچنا تھا۔ اُسے واشنگٹن پہنچ کر ائیر پورٹ پر میرا اانتظار کرنا تھا۔ جہاں سے ہمیں ایک ہی جہاز سے ماسکو جانا تھا۔

لیکن اُس کی فلائٹ کی تاخیر نے ہماراسارا پروگرام تلپٹ کر دیا تھا۔ تاہم یونائیٹڈ ائیر لائن کے مشّاق عملے نے ایک گھنٹ بعد براستہ برسلز ماسکو جانے والی فلائٹ پر ہماری پرواز کا بندوبست کر کے ہمارے پروگرام کو ایک بار پھر صحیح راستے پر ڈال دیا تھا۔

اِس طرح چند منٹ بعد ہم براہِ راست ماسکو جانے والی فلائٹ کی بجائے براستہ برسلز ماسکو جانے والی فلائٹ پر سوار تھے۔

پرواز کے دوران میں نے علی سے اُس کی رُوس جانے کی کہانی سنی۔ میرا خیال تھا کہ لاہور میں بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں کی طرح وہ بھی سوویت یونین کے نظریئے سے متاثر ہو کر نوعمری میں ماسکو چلا گیا ہو گا۔ لیکن اُس نے اپنے رُوس جانے کی ایک دوسری ہی وجہ بتائی۔

میں نے اُس سے پوچھا کہ پڑھے لکھے پاکستانی زیادہ تر یورپ اور امریکہ کا رُخ کرتے ہیں جبکہ محنت مزدوری کرنے والے پاکستانی مڈل ایسٹ جاتے ہیں لیکن اُس نے رُوس جانے کا فیصلہ کب اور کیوں کیا۔
میرے استفسار پر اُس نے مجھے بتایا کہ اُس کا لاہور میں ایک بہت بڑی فیملی سے تعلق ہے۔ بڑی فیملی سے اُس کی مراد بااثر نہیں بلکہ افرادی اعتبار سے بڑی فیملی ہے جس میں نو بہن بھائی اور دو ماں باپ یعنی گھر کے گیارہ افراد تھے۔ اِس فیملی میں وہ سب سے چھوٹا ہے۔ اُس نے مجھے بتایا کہ اِتنی بڑی فیملی میں بچپن میں اُسے جس توجہ اور انہماک کی ضرورت تھی وہ مفقود تھی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پڑھائی میں توجہ مرکوز کرنا اُس کے لئے مشکل ثابت ہوا۔
چنانچہ تعلیم کے اہم ترین مرحلے یعنی ایف ایس سی میں بقول اُس کے اُس کے نمبر خاصے مایوس کن آئے۔ وہ ایف ایس سی کر کے انجینئرنگ میں داخلہ لینا چاہتا تھا۔ لیکن ایف ایس سی میں کم نمبر پاکستان میں اُس کے مقصد کے حصول میں رکاوٹ بن گئے۔ اُس نے بہت کوشش کی کہ اُسے پاکستان میں کسی انجینئرنگ کالج میں داخلہ مل جائے لیکن خراب نمبروں کی وجہ سے ایسا ممکن نہ ہو سکا۔
اِس دوران اُس کا ایک دوست جس کے نمبر اُس سے بھی کم تھے سوویت یونین چلا گیا۔ وہ وہاں پر انجینئرنگ پڑھ رہا تھا۔
اپنی چھٹیوں کے دوران اُس کا دوست لاہور آیا تو اُس نے علی کو بتایا کہ اگر وہ چاہے تو وہ اُسے بھی رُوس میں یونیورسٹی میں انجینئرنگ میں داخلہ دلا سکتا ہے۔ علی کے دوست نے اُسے بتایا کہ اِس مقصد کے لئے اُسے چھ ماہ میں رُوسی زبان لکھنی پڑھنی اور بولنی سیکھنی ہو گی۔ اگر چھ ماہ میں اُس نے رُوسی میں مہارت حاصل کر لی تو پھر رُوس میں کسی یونیورسٹی میں انجینئرنگ کرنا اُس کے لئے چنداں مشکل نہیں ہو گا۔ علی نے مجھے بتایا کہ اُس کو چھ ماہ میں رُوسی سیکھنا ایک مشکل چیلنج محسوس ہوا لیکن اُس نے اپنے دوست کے

کہنے پر کوشش کرنے کی ٹھانی اور دوست کو ماسکو میں رُوسی زبان سکھانے والے اسکول میں داخلے کے پیسے ادا کر دیئے۔ علی کے دوست نے رُوس پہنچ کر زبان سکھانے والے اسکول میں اُس کا داخلہ کرا دیا۔ اِس طرح علی جس سال سوویت یونین ٹوٹا پاکستان سے بطور طالب علم رُوس پہنچا۔ علی نے اپنی توقعات کے برعکس چھ ماہ میں رُوسی زبان میں مکمل دسترس حاصل کر لی۔ اِس طرح ترکِ وطن کر کے اُس نے اپنے انجینئرنگ کرنے کے خواب کی تکمیل کا سامان کر لیا۔

علی کی کہانی خاصی متاثر کن تھی۔ اُس کی کہانی سُن کر مجھے دنیا بھر کے ملکوں میں بکھرے لاکھوں پاکستانی نوجوان یاد آئے جو اپنے خوابوں کے تعاقب میں پوری دنیا میں سرگرداں ہیں۔ علی کی کہانی سُن کر مجھے یقین ہو گیا کہ رُوس میں ایک دلچسپ اور بھرپور منظر نامہ میرا منتظر ہے۔

میں نے اب تک جتنے سفر کئے تھے اُن کی فطرت اور نوعیت مختلف قسم کی تھی۔ شہروں شہروں اور ملکوں ملکوں جانا۔ ہوٹلوں میں رہنا۔ ٹیکسی پکڑ کر ہوٹل پہنچنا۔ ہوٹل جا کر شہر اور ملک کے بارے میں معلومات اکٹھا کرنا۔ پھر اکٹھا کردہ معلومات کے مطابق اُن جگہوں پر جانا، گھومنا پھرنا، اجنبی لوگوں سے اُن مقامات کے متعلق کہانیاں سننا اور چند دن وہاں گزار کر واپس آ جانا اور اپنی دیکھی ہوئی جگہوں اور سُنی ہوئی کہانیوں کو اپنے قارئین سے شیئر کرنا۔ لیکن رُوس کی سیاحت کی علی کی وجہ سے صورتِ حال قدرے مختلف ہو چکی تھی۔ میں پہلی بار ایک نئے ملک جا رہا تھا جس کی زبان سے میں بے بہرہ تھا۔ جہاں ہوٹل میں رہنے کی بجائے مجھے علی کے مقامی دوست کے گھر میں رہنا تھا۔ مثال کے طور پر ماسکو میں ہم پاول کے اپارٹمنٹ پر رہنے جا رہے تھے۔

پاول کا ذکر میں پہلے کئی بار علی سے سُن چکا تھا۔ وہ علی کا کالج کے زمانے کا دوست تھا۔ علی اور ناستیا جب بھی چھٹیوں پر ماسکو جاتے ہیں اُسی کے اپارٹمنٹ پر ٹھہرا کرتے ہیں۔ لیکن میری پاول سے یہ پہلی ملاقات

ہونے جارہی تھی۔ پاول کیسا آدمی ہے؟ علی سے اُس کی پرانی جان پہچان اور دوستی ہے لیکن میری اُس سے نہ کبھی ملاقات ہوئی نہ بات چیت۔ ایک بار وہ یوایس اے آیا بھی۔ لیکن ایسٹ کوسٹ پر گھوم پھر کر واپس چلا گیا۔ اُسے ویسٹ کوسٹ آنے کا موقع نہ ملا۔ اس طرح اُس سے کبھی پہلے ملاقات نہ ہو سکی۔

میں سوچ رہا تھا کیا اُس کا اپارٹمنٹ اتنا بڑا ہے کہ میں اور علی با آسانی وہاں ٹھہر سکتے ہیں؟ پاول کے لئے کوئی مسائل تو نہیں ہوں گے؟ ہماری وجہ سے اُس کی زندگی کی روٹین متاثر تو نہیں ہو گی؟

یہی باتیں سوچتے سات گھنٹے کب گزر گئے کچھ پتہ نہ چلا۔ برسلز میں جہاز اُترنے سے گھنٹہ بھر قبل ائیر ہوسٹسوں نے مسافروں کو ناشتہ کرانا شروع کر دیا۔ جی تو نہیں چاہتا تھا کہ اُس وقت جہاز میں کچھ کھایا جائے۔ لیکن برسلز میں میرے گزشتہ ٹرپ کے کچھ واقعات ذہن میں آئے جس کی وجہ سے میں نے مناسب جانا کہ جہاز میں ہلکا پھلکا ناشتہ کر لیا جائے تو بہتر رہے گا۔ میں وقتی طور پر پاول کو بھُلا کر ناشتے میں مصرف ہو گیا۔

ابھی ائیر ہوسٹسوں نے ناشتے کا سلسلہ ختم کر کے مسافروں سے گاربیج اکٹھا کیا ہی تھا کہ جہاز برسلز کے ائیر پورٹ پر لینڈ کر گیا۔

ہماری باقی ماندہ فلائٹ سبرینا ائیر لائن سے تھی۔ اگلا جہاز برسلز سے دو گھنٹے بعد روانہ ہونا تھا۔ چنانچہ میں اور علی یونائیٹڈ ائیر لائن سے اتر کر آہستہ آہستہ سبرینا ائیر لائنز کے گیٹ کی طرف روانہ ہوئے۔ اِس دوران ہمیں برسلز ائیر پورٹ پر ایک بار پھر سیکورٹی کے عمل سے گزرنا پڑا۔ سیکورٹی سے گزر کر ہم دوسرے گیٹ پر پہنچے تو گیٹ ابھی تک سنسان پڑا تھا۔ چند ایک مسافروں کے سوا وہاں کوئی نہیں تھا۔ دو تین رُوسی خواتین تھیں جن کے ساتھ کافی تعداد میں بچے تھے۔ اتنے بچے اِن خواتین کے اپنے نہیں ہو سکتے تھے۔ کیوں کہ رُوسی خاندان عام طور پر دو تین بچوں پر مشتمل ہوتے ہیں ۔ وہ شاید چھوٹے

اپارٹمنٹوں میں رہنے کی وجہ سے دو تین سے زیادہ بچے پیدا نہیں کرتے۔ لگتا تھا یہ کوئی اسکول ٹیچر تھیں جو بچوں کو ٹرپ پر برسلز لے کر آئیں تھیں اور اب ماسکو واپس جارہی تھیں۔ میں اُن کی باہمی گفتگو میں سے الفاظ اخذ کر کے علی سے اُن کا مطلب پوچھ رہا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ کسی خاص موضوع پر گفتگو نہیں کر رہیں تھیں۔

جیسے جیسے فلائٹ کا وقت قریب پہنچا گیٹ کی سنسانی ختم ہونا شروع ہو گئی اور بہت سے رُوسی خواتین و حضرات گیٹ پر پہنچ گئے۔

مِیں نے کبھی کبھار اِکا دُکا رُوسی تو امریکہ میں اِدھر اُدھر دیکھے تھے لیکن اتنے زیادہ رُوسی لڑکے، لڑکیاں اور خواتین اور مرد پہلی بار دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اُن کے طور طریقے دیکھ کر میں نے علی سے کہا کہ رُوسی تو دیکھنے اور اپنی عادات واتوار میں ہمارے پٹھان بہن بھائیوں جیسے لگتے ہیں۔ علی نے کہا کہ آپ کا یہ مشاہدہ بالکل درست ہے۔

چونکہ علی بارہ تیرہ سال سے رُوس میں رہ رہا تھا اور اُس کی بیوی بھی رُوسی تھی اور وہ خود بھی رُوسی کلچر میں رچا بسا تھا اِس لئے اُس کا میری رائے سے اتفاق کرنا مجھے اچھا لگا۔ علی نے رُوسیوں کے بارے میں اپنے مشاہدات سے اتفاق کرتے ہوئے مجھے بتایا کہ رُوسی مرد خاصے اکھڑ مزاج ہوتے ہیں جبکہ رُوسی خواتین بہت نرم خو اور نرم مزاج ہوتی ہیں۔

ایک اور دل چسپ بات اُس نے مجھے رُوسیوں کے بارے میں یہ بتائی کہ رُوسی مرد زیادہ تر کام کاج سے گریز کرتے ہیں جبکہ کام کاج کا زیادہ تر بوجھ رُوسی خواتین پر ہوتا ہے۔ وہی کام کرتی اور کمائی کرتی ہیں جب کہ رُوسی مرد زیادہ تر بے کار رہنا پسند کرتے ہیں۔

ابھی ہم یہ گفتگو کر رہے تھے کہ بورڈنگ شروع ہو گئی۔ میں اور علی بھی اپنے بیگ اٹھا کر بورڈنگ کی لائن میں کھڑے ہو گئے۔ ایئر لائن گیٹ پر جمع مسافروں کو بسوں میں بھر کر جہاز تک لے جا رہی تھی۔

بورڈنگ پاس چیک کرنے والی کلرک سے گزر کر ہم بھی بس پر سوار ہو کر جہاز تک پہنچے۔ سبرینا ایئر لائن کا یہ ایک درمیانے سائز کا جہاز تھا جس میں سو سوا سو کے قریب مسافر سوار ہوئے۔

بورڈنگ مکمل ہوئی تو جہاز آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے رن وے تک آیا اور پھر پوری رفتار سے بھاگتے ہوئے ہوا میں پرواز کر گیا۔ جہاز میں ایک نوجوان رُوسی لڑکا اور ایک ادھیڑ عمر کی رُوسی خاتون جہاز کے اگلے اور دو رُوسی خواتین جہاز کے پچھلے حصے میں سروس کر رہے تھے۔

اگلے حصے والی خاتون اور لڑکا دونوں خاصے خوش مزاج تھے۔ وہ خوب بھاگ دوڑ کر مسافروں کی مدد اور خدمت کر رہے تھے۔ جہاز کی ظاہری حالت ایئر لائن کی خستہ حالی کی داستان سنا رہی تھی۔ شاید جہاز کے عملے کے ارکان اپنی خوش مزاجی اور گرم جوشی سے جہاز کی خستہ حالی کی کمی پوری کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اُنہیں اندازہ نہیں تھا کہ ہوائی سفر کرنے والے مسافروں کے ذہن میں اپنی سلامتی ایک اہم فیکٹر ہوتا ہے جس کا اندازہ اُنہیں جہاز کی ظاہری صحت دیکھ کر ہوتا ہے۔

جہاز کا حال دیکھ کر مجھے پی آئی اے کے اندرونِ ملک چلنے والے خستہ حال جہاز یاد آئے۔ پی آئی اے عام طور پر یہ جہاز دوسری ایئر لائینوں سے خریدتی ہے جہاں وہ اپنے فلائنگ آورز پورے کر چکے ہوتے ہیں۔ پی آئی اے دوسری ایئر لائینوں سے یہ جہاز خریدتے وقت بھول جاتی ہے کہ اِن جہازوں پر سوار ہونے والے اِن کی میکانکی تھکاوٹ کی وجہ سے کب اور کن حالات میں لقمہ اَجل بن جائیں گے۔

برسلز سے ماسکو کی فلائٹ پورے تین گھنٹے کی تھی۔ میں اور علی سب سے اگلی رَو میں دو سیٹوں پر براَجمان تھے۔ ہمارے پیچھے والی رَو میں ایک نازک مزاج نوجوان رُوسی خاتون اپنے اکھڑ مزاج رُوسی خاوند کے

ساتھ بیٹھی سونے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ میں اور علی جہاز کے شور کی وجہ سے پنجابی میں قدرے اُونچی آواز میں گفتگو کر رہے تھے جو کہ اُس کی نیند کی کوششوں میں حائل ہو رہی تھی۔ اُس نے اپنے خاوند سے ہماری شکایت کی۔ جس نے رُوسی زبان میں علی سے کچھ کہا۔ میرے استفسار پر علی نے بتایا کہ ہماری گفتگو اُس کی بیوی کو ناگوار گزر رہی ہے۔ میں اور علی نے اُس رُوسی خاتون کو ناگوار گزرنے والی اپنی آوازیں مزید مدہم کر لیں۔ حالانکہ اِرد گرد کی سیٹوں پر بیٹھی رُوسی خواتین اِس طرح اونچی آواز میں گفتگو کر رہی تھیں اور قہقہے لگا رہی تھیں جیسے وہ جہاز کی بجائے اپنے ڈرائنگ روموں میں بیٹھی گپ شپ میں مصروف ہوں۔

تین گھنٹے کی پرواز کے بعد سبرینا ائیر لائن کا طیارہ ماسکو کی حدود میں داخل ہوا تو میں جیب سے کیمرہ نکال کر ونڈو سیٹ پر آن بیٹھا تا کہ ماسکو کے ہوائی مناظر کی تصویریں بناؤں۔ لیکن تہہ در تہہ بادلوں میں لپٹے ماسکو نے مجھے ایسی کسی تصویر کشی کا موقع فراہم نہ کیا۔

ہمارا جہاز کافی دیر تک ماسکو کے اُوپر فضا میں چکر لگاتا رہا۔ کیونکہ بار بار وہی سین دکھائی دے رہے تھے اِس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ائیر پورٹ اتھارٹی نے مصروفیت کی وجہ سے ابھی اُس کو لینڈنگ کی اجازت نہیں دی۔ عام طور پر ایسی صورت میں جہاز کے پائلٹ مسافروں کو بتا دیتے ہے کہ اُنہیں فی الحال لینڈنگ کی اجازت نہیں مل رہی۔ لیکن ہمارے پائلٹ نے مسافروں کے ساتھ ایسی کوئی انفارمیشن شیئر کرنے سے گریز کیا۔

جہاز سے ماسکو مجھے دنیا کے باقی شہروں سے بہت مختلف لگا۔ ایک تو فضا سے زمین پر ماسکو کے یکجا شہر ہونے کے آثار مجھے کہیں دکھائی نہ دیئے۔ ایک شہر کی بجائے فضا سے مجھے بے شمار پانی کے ذخیروں اور جنگلوں

کے درمیان کہیں کہیں کچھ آبادیاں دکھائی دیں۔ مجھے لگا شاید ماسکو کی بطورِ شہر دوسرے شہروں سے کچھ ہٹ کر پلاننگ کی گئی ہے۔

امریکہ اور یورپ کے بڑے شہروں کی حدود میں جب جہاز داخل ہوتے ہیں تو آبادیوں کا ایک نہ ختم ہونے والے شہروں کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ فلک بوس عمارات دکھائی دیتی ہیں۔ فری ویز پر گاڑیوں کی لمبی قطاریں حرکت کرتی دکھائی دیتی ہیں لیکن ماسکو کی فضا سے ایسا کچھ دکھائی نہ دیا۔ دُور دُور بکھری آبادیوں کے سوا امریکی شہروں کی طرح ڈاؤن ٹاؤن کی فلک بوس عمارتیں کہیں دکھائی نہ دیں۔

ماسکو کی بکھری ہوئی آبادیاں دیکھ کر مجھے امریکہ کے جاسوسی کرنے والے یو-۲ طیارے یاد آئے جو پشاور سے اڑ کر امریکہ کے لئے جاسوسی کرنے کے لئے رُوسی حدود میں آتے تھے۔ یہ سلسلہ تب تک جاری رہا جب تک روس نے اُن میں سے ایک طیارہ مار نہیں گرایا تھا۔ تب خروشچیف نے اپنے دفتر میں آویزاں دنیا کے نقشے پر پاکستان کے شمالی شہر پشاور کے گرد سرخ دائرہ لگا دیا تھا۔

میں ماسکو کی فضا میں اُڑتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ یہاں تو زمین کے بالکل قریب اُڑتے ہوئے بھی روس کے دارلخلافے کے نشانات کہیں دکھائی نہیں دیتے پھر یہ یو-۲ طیارے یہاں کیا لینے آتے تھے۔ لیکن تب سرد جنگ کا زمانہ تھا۔ اب بات اور تھی۔ تب سوویت یونین نے اپنے اِرد گرد تعمیر کی ہوئی غیر مرئی دیواروں کی وجہ سے اپنے اندر بہت سے راز چھپا رکھے تھے۔ اب تو روس ساری دنیا کے لئے کھلا ہے۔ جو بھی چاہے آئے اور جیسے چاہے روس کو دیکھے۔ اب روس کے بارے میں بات کرتے ہوئے کسی ذہن میں ریچھ کا تصور نہیں ابھرتا جب کہ اُس وقت کسی ذہن کے لئے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ رُوس کو ریچھ کے تصور سے جدا دیکھے۔ ماسکو کے اُوپر پرواز کرتے ہوئے جہاں مجھے بادلوں کی دبیز تہوں نے اجازت دی

میں نے ماسکو کی اِن بکھری آبادیوں کی تصویریں بنائیں شاید اِن میں سے کوئی ایک آدھ میری بات کی وضاحت کے لئے اچھی نکل آئے۔

جہاز اِسی طرح ماسکو پر بلا مقصد آدھ گھنٹہ پرواز کرنے کے بعد آخر ڈوموڈیڈیوو ائیر پورٹ پر لینڈ کر گیا۔ ماسکو کی فضائی ضروریات کے لئے تین ائیر پورٹ بنائے گئے ہیں۔ ڈوموڈیڈیوہ، شریمیٹووہ اور ونکووہ۔ یہ تینوں انٹرنیشنل ائیر پورٹ ہیں۔ شریمیٹووہ ائیر پورٹ رُوسی ائیر لائن ائیر وفلوٹ کا حب ہے۔ جب کہ دوسری بین الاقوامی ائیر لائنوں کے زیادہ تر طیارے ڈوموڈیڈیوہ پر لینڈ کرتے ہیں۔ تینوں ائیر پورٹوں کا سنٹرل ماسکو سے تقریباً ایک جتنا فاصلہ ہے۔

ڈوموڈیڈیوہ سوویت دور میں 1954 میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اُس کے بعد 2000 کے بعد مرحلہ وار سالانہ بنیاد پر ائیر پورٹ کی تزئین و آرئیش پر کام کیا گیا۔ جدید سہولیات کا اضافہ کیا گیا۔ جس کے نتیجے میں ڈوموڈیڈوہ اب یورپ کے چند بڑے ائیر پورٹوں میں شمار ہوتا ہے۔ ہر سال تقریباً چھبیس ملین مسافر ڈوموڈیڈوہ کے ذریعے رُوس آتے اور رُوس سے بیرونی دنیا میں سفر کرتے ہیں۔ جدید سہولتوں سے مزّین ہونے کے باوجود ڈوموڈیڈوہ کے انداز دیکھ کر مجھے لگا کہ ہم دنیا کی سابقہ سپر پاور کے ائیر پورٹ پر نہیں

ڈوموڈیڈوہ ائیرپورٹ کاایک منظر

اُترے بلکہ کسی عام سے ملک کے ایئر پورٹ پر اُترے ہیں جہاں چیزیں ابھی اپنی اصل شکل تک نہیں پہنچ پائیں۔

ہم جہاز سے اُتر کر امیگریشن کاونٹر تک آئے تو وہاں دیگر ممالک کی طرح رُوسی شہریوں اور دیگر ممالک کے شہریوں کے لئے الگ الگ کاؤنٹر بنے ہوئے تھے۔ یہاں علی مجھ سے الگ ہو کر رُوسی شہریوں والے کاؤنٹرز پر چلا گیا جب کہ میں غیر شہریوں کے کاؤنٹرز کی لائن میں کھڑا ہو گیا۔

لائین میں دوسرا نمبر میرا تھا۔ مجھ سے پہلے ایک میاں بیوی اکٹھے اپنے پاسپورٹ امیگریشن افسر سے اسٹیمپ کرا رہے تھے۔ وہ دیکھنے میں ہندوستانی لگتے تھے جن کے ہاتھ میں کسی یورپی ملک کے پاسپورٹ تھے۔ وہ کاؤنٹر سے ہٹے تو میں کاؤنٹر پر جا کھڑا ہوا۔ امیگریشن افسر نے ویزے والا صفحہ کھول کر دیکھا اور میرا پاسپورٹ اسٹیمپ کر کے بغیر کوئی سوال کئے میرے حوالے کیا۔ میں پاسپورٹ لے کر امیگریشن کی حدود سے باہر آیا تو علی پہلے سے وہاں میرا منتظر تھا۔ ہم دونوں کسٹم کی حدود میں داخل ہوئے تو کسٹم افسر نے ہمارے بیگ مشین میں اسکین کئے۔ علی کو یہ اچھا نہ لگا لیکن میں نے یہ کہہ کر اُس کی ڈھارس بندھائی کہ یہ ۹/۱۱ کے تحفے ہیں اور ہمیں ابھی اِن کے ساتھ کچھ عرصہ زندہ رہنا ہے۔ ویسے میں بھی آج تک یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ایک مسافر جو اتنی سیکورٹیز سے گزر کر آتا ہے ایئر پورٹ سے باہر نکلتے ہوئے اُس کا سامان اسکین کرنے کا کیا جواز ہے؟ کیا جنھوں نے پہلے اُس کا سامان اسکین کیا تھا وہ جاہلِ مطلق اور احمق تھے کہ تم جاتے جاتے ایک بار اور اُس کا سامان مشین میں اسکین کرنا چاہتے ہو۔ لیکن کیا کیا جائے اب انسان مکمل طور پر مشینوں کے نرغے میں پھنس چکا ہے اور شاید اب اُس کی اِن سے نجات ممکن نہیں۔

امیگریشن اور کسٹم کے مرحلے کی تکمیل کے بعد ہم کسٹم سے باہر آئے تو بالکل لاہور ائیرپورٹ کا سین تھا۔ سینکڑوں رُوسی مرد اور عورتیں باہر سے آنے والے اپنے عزیزو اقارب کے استقبال کے لئے ائیر پورٹ پہنچے ہوئے تھے۔ مسافروں کے لاؤنج میں ایک عجیب حشر بپا تھا۔ کوئی پتہ نہیں کون کسے ڈھونڈ رہا تھا۔ ہم بھی اپنے میزبان پاول کو ڈھونڈ رہے تھے۔

میری پاول سے پہلے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ علی اور ناستیا سے اُس کا ذکر سنا تھا۔ البتہ ملاقات پہلی بار ہو رہی تھی۔ مجھے ایک جگہ کھڑا کرکے علی نے ائیر پورٹ کے اندر رُوسیوں کے جم غفیر کے درمیان ایک چکر لگایا اور چند منٹ میں پاول کو ساتھ لئے میرے پاس چلا آیا۔

پاول کی انگریزی واجبی سی تھی۔ بہرحال وہ انگریزی زیادہ اور میں رُوسی کم جانتا تھا۔ چند جملے یاد تھے جو نہ جاننے کے برابر تھے۔ لیکن ہم نے رُوسی اور انگریزی مکس کرکے ایک دوسرے کے لئے اچھے جذبات کا اظہار کیا۔ جہاں ہم اٹکے علی نے میری رُوسی اور پاول کی انگریزی کے درمیان بیچ بچاؤ کرا دیا۔

پاول دیکھنے میں پچیس چھبیس برس کا نوجوان دکھائی دیتا تھا لیکن بعد میں پتہ چلا کہ اُس کی عمر کوئی اڑتیس برس کے قریب ہے۔ پاول صرف اپنی اصل عمر سے ہی دس بارہ برس کم دکھائی نہیں دیتا تھا بلکہ اُس میں ابھی تک نوجوانوں والی معصومیت اور دلکشی بھی موجود تھی۔

پاول ہمیں ساتھ لئے ائیر پورٹ سے باہر نکلا تو ہمارا خیال تھا امریکہ کی طرح کوئی ملٹی اسٹوری پارکنگ لاٹ ہوگا جہاں پاول کی گاڑی کھڑی ہوگی لیکن وہاں ہمیں کوئی ایسا پارکنگ لاٹ دکھائی نہ دیا۔ ہم پیدل چلتے ائیر ٹرمینل کی بائیں طرف آئے تو وہاں ہمیں ایک لاٹ میں بہت سی گاڑیاں کھڑی دکھائی دیں۔ اِنہی میں سے ایک پاول کی گرے رنگ کی ٹویوٹا کار تھی۔

پاول نے ڈگی کھول کر ہمارے بیگ اُس میں رکھے اور ہم تینوں گاڑی میں سوار ہو کر پارکنگ لاٹ سے باہر نکلنے کی جدوجہد کرنے لگے۔ پارکنگ لاٹ سے باہر نکلنے کا ایک ہی راستہ تھا۔ ہر گاڑی والا کوشش کر رہا تھا کہ وہ دوسرے سے پہلے نکل لے لیکن پارکنگ لاٹ جس طرح ڈیزائین کیا گیا تھا اُس میں سے نکلنا یقیناً آسان کام نہیں تھا۔

ٹریفک میں پھنسے پاول نے جیب سے روبلز کی ایک گڈی نکال کر علی کو دی کہ کم از کم وہ پارکنگ فیس ادا کر کے اُن سے باہر نکلنے کا پروانہ لے آئے۔ علی گاڑی سے نکل کر پیدل چلتا فیس وصول کرنے والے عملے کے پاس پہنچا اور ٹکٹ دکھا کر پیسے ادا کر کے اُن سے رسید لیتا آیا۔ خدا خدا کر کے کوئی آدھ گھنٹے کی جدوجہد کے بعد ہم پارکنگ لاٹ سے باہر نکلے تو ایک دو رُویہ سڑک ہمارے سامنے تھی۔ سڑک کے دونوں طرف اُونچے اُونچے درخت لگے تھے۔ درخت انتہائی گھنے اور بلند تھے۔ لیکن اُنہیں دیکھ کر یہ بتانا مشکل تھا کہ درخت کس چیز کے ہیں۔ پھل دار ہیں یا غیر پھل دار۔

پاول نے گاڑی ماسکو والی لین میں ڈالی تو سڑک پر یو ایس اے کی فری ویز کا احساس ہوا۔ راستے میں جگہ جگہ رُوسی زبان میں بورڈ لگے تھے۔ جن پر اِرد گرد کے علاقوں کے نام درج تھے۔

میں نے پاول سے پوچھا کہ جہاز میں سے ہمیں ماسکو کہیں شہر کی طرح دکھائی نہیں دیا۔ اُس نے بتایا کہ ماسکو شہر کے اوپر جہازوں کی پرواز منع ہے۔ جہاز سے آپ لوگوں نے جو کچھ دیکھا وہ سب شہر کے اِرد گرد بنی بستیاں ہیں۔ چونکہ جہاز شہر کے اُوپر نہیں جاتا اِس لئے آپ جہاز سے سنٹرل ماسکو کا منظر نہیں دیکھ سکتے۔

پاول کی توجیہہ کے بعد اطمینان ہوا کہ ہم نے ہوا میں ماسکو کی جو تصویر اپنے ذہن میں بنائی تھی وہ صحیح نہیں تھی۔ اگر وہ صحیح ہوتی تو ہمیں بہت مایوسی ہوتی۔ ہمارے رُوسی میزبان پاول نے ہمیں مایوسی سے بچا لیا۔

کوئی آدھ گھنٹہ گاڑی مین سڑک پر دوڑنے کے بعد سڑک میں سے نکلتی ایک چھوٹی سڑک پر مڑ گئی۔ چھوٹی سڑک کے ساتھ دس دس منزلہ سفید رنگ کی بلڈنگوں کا ایک سلسلہ تھا جن کے اِرد گرد مزید کم چوڑی سڑکیں اور سڑکوں کے گردو ہی اونچے درخت تھے جن میں بلڈنگیں تقریباً رُوپوش ہو رہی تھیں۔ جہاز سے اِن بلڈنگوں کے نہ نظر آنے کی وجہ یہی بلند و بالا درخت تھے۔ کیونکہ درختوں کی اونچائی تقریباً بلڈنگوں کی چھتوں تک چلی گئی تھی۔ ایسی ہی ایک بلڈنگ کے سامنے پاول نے اپنی ٹویوٹا کار کھڑی کی۔ ہم نے گاڑی کی ڈِگی سے اپنے بیگ نکالے اور پاول کے پیچھے چلتے بلڈنگ میں داخل ہو گئے۔ بلڈنگ میں داخل ہونے کے ایسے سات راستے تھے۔ بظاہر بلڈنگ ایک تھی لیکن اِس کی تعمیر اِس طرح کی گئی تھی کہ اِس کے ایک ایک فلور پر ایک ایک حصے میں چار چار اپارٹمنٹ بن گئے تھے۔ گویا چار یونٹوں کو ملا کر بلڈنگ کا ایک حصہ بنتا تھا۔ بلڈنگ کے ایک حصے سے دوسرے حصے تک رسائی ممکن نہیں تھی۔ اگر کوئی کسی دوسرے حصے میں جانا چاہتا تو اُسے نیچے جا کر بلڈنگ کے متعلقہ حصے کے داخلے کے راستے سے بلڈنگ میں داخل ہونا پڑتا۔

پاول کا اپارٹمنٹ پانچویں فلور پر تھا۔ اُوپر جانے کے لئے سیڑھیاں بھی تھیں اور دو چھوٹی لفٹیں بھی جن میں ایک وقت میں چار آدمی بمشکل کھڑے ہو سکتے تھے۔ اپارٹمنٹوں کی ڈیزائننگ بہت اچھی کی گئی تھی۔ اپارٹمنٹ کا دروازہ کھلتے ہی ایک چھوٹی سی راہداری جس کے دائیں ہاتھ اختتام پر ایک بڑا بیڈ روم بنا تھا ۔اپارٹمنٹ کے مین دروازے کے سامنے ایک ڈرائنگ روم تھا جسے بیڈ روم کے طور پر بھی استعمال کیا جا

سکتا ہے۔ راہداری کے بائیں طرف سب سے پہلے باتھ روم جس میں یورپین اسٹائل باتھنگ ٹب اور ایک سنک اور کپڑے سکھانے کی ایک مشین نصب ہے۔ باتھ روم کے ساتھ اگے ایک چھوٹی سی ٹائلٹ بنی ہے۔ ٹائلٹ سے آگے کچن ہے۔ کچن کا سائز معقول ہے جس میں ایک ریفریجریٹر ایک گیس کا چولہا جس پر چار چولہے نصب ہیں اور نیچے اوون ہے۔ ریفریجریٹر کے ساتھ ایک فریزر ہے جس میں الگ سے وافر مقدار میں کھانے پینے کا سامان فریز کیا جا سکتا ہے۔ چولہوں کے ساتھ جدید سِنک ہے جس کی ٹیپس میں سے گرم اور ٹھنڈا پانی آتا ہے جسے برتن دھونے کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ چولہوں کے اُوپر لکڑی کے کیبنٹ بنے ہیں جن میں برتن اور کھانے پینے کی خشک چیزیں رکھی ہیں۔

چولہوں سے قدرے ہٹ کر کھانے کی ٹیبل ہے جس کے گرد چار کرسیاں رکھی ہیں جن پر بیٹھ کر چار افراد آسانی سے کھانا کھا سکتے ہیں۔ ٹیبل کے ساتھ دو اور کرسیاں بھی رکھی جا سکتی ہیں جن پر دو اور افراد ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا سکتے ہیں۔ اپارٹمنٹ کی پچھلی دیوار میں جو کہ بیڈ روم، ڈرائنگ روم اور کچن میں مشترک ہے کھڑکیاں نصب ہیں جن سے سے مسلسل ہوا سے سرگوشیاں کرتے درختوں کا منظر دیکھا جا سکتا اور اُن کی سرگوشیاں سُنی جا سکتی ہیں۔ کبھی کبھار نیچے چلتی گاڑی کا شور یا درختوں میں بیٹھے کسی کوئے کی کائیں کائیں بھی سُنائی دیتی ہے۔

آج کل ماسکو میں بڑھتے ہوئے جرائم کی وجہ سے پاول نے اپارٹمنٹ میں داخلے کا دوہرا دروازہ نصب کر رکھا ہے۔ دونوں دروازوں پر دو دو تالے لگے ہیں۔ داخلے کے لئے اُن دونوں دروازوں کے تالوں کو کھولنا پڑتا ہے۔ لیکن ساتھ والے اپارٹمنٹ میں داخلے کے لئے ایک پٹ والا دروازہ ہی نصب ہے۔ شاید اُس اپارٹمنٹ کا مکین خود کو پاول کی نسبت زیادہ محفوظ محسوس کرتا ہے۔

پاول نے مجھے بتایا کہ یہ عمارتیں خروشچیف کے زمانے میں رہائش کے مسائل حل کرنے اور آبادیوں کو آرگنائز کرنے کے لئے بنائی گئی تھیں۔ سوویت یونین میں ورکرز اِن اپارٹمنٹس میں مفت رہتے تھے۔ سوویت یونین کے خاتمے کے بعد اِن کو فروخت کر دیا گیا ہے اور اب اِس اپارٹمنٹ کی قیمت ڈھائی تین لاکھ امریکی ڈالروں کے برابر ہے۔

ڈالروں کے ذکر سے یاد آیا کہ دیگر ممالک کی انحطاط پذیر کرنسیوں کی طرح روس کی کرنسی کے انحطاط پذیر ہونے کی وجہ سے روسی بھی روبلز کی بجائے ڈالرز پر زیادہ اعتماد کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر روسی اپنی بچت ڈالرز میں محفوظ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

پاول کچن ٹیبل پر بیٹھا یہ باتیں بتا رہا تھا لیکن میری تھکاوٹ اور نیند کی وجہ سے آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ میں نے علی اور پاول سے اجازت لی اور ڈرائنگ روم میں رکھے بستر نما صوفے پر لیٹ گیا۔ پاول نے میرے لئے صوفہ کھول کر بیڈ میں تبدیل کر دیا۔ بیڈ پر لیٹتے ہی میں گہری نیند میں چلا گیا جب کہ علی اور پاول مجھے سوتا چھوڑ کر اپارٹمنٹ کے قریب ہی واقع ایک گروسری اسٹور سے گروسری لینے چلے گئے۔

میں کوئی دو گھنٹے سو کر اُٹھا تو پاول اور علی نے رات کا ڈنر تیار کر دیا تھا۔ ڈنر میں چکن سلاد اور رائی کی روٹی تھی۔

پاول کا چکن پکانے کا طریقہ بہت سادہ تھا۔ اس نے فرائی پین میں آئل ڈال کر گرم ہونے کے لئے رکھا۔ آئل میں ہلکا نمک ڈالا۔ جب آئل گرم ہو گیا تو اُس نے اُس میں چکن کے ٹکڑے ڈال دئے۔ ہلکی آنچ پر چکن تقریباً دس منٹ میں تیار ہو گیا۔ آگ بند کرنے سے پہلے اُس نے چکن پر ہلکے ہلکے مصالحے چھڑک دیئے۔

میں نے آج تک چکن پکانے کا یہ طریقہ نہیں دیکھا تھا۔ چکن اِتنے سادہ طریقے سے پکایا گیا تھا لیکن پھر بھی مزے دار تھا۔ سلاد اور رائی کی روٹی اور چکن کھانے کے بعد پاول نے چائے سے ہماری تواضع کی۔

ہم جمعہ کے دن یو ایس اے سے روانہ ہوئے تھے۔ آج ہفتے کی رات ہو چکی تھی۔ یہ روس سے ہمارا پہلا تعارف تھا۔

رُوس میں دوسرا دن

میں نے چونکہ آتے ہی دو گھنٹے نیند کر لی تھی اور اِس کے بعد ڈنر کر کے جلدی سو گیا تھا اس لئے صبح جلد ہی بیدار ہو گیا لیکن علی اور پاول صبح نو بجے کے قریب اُٹھے۔

رات پاول نے مجھے اپنا انٹرنیٹ سسٹم سمجھا دیا تھا۔ میں نے صبح ہی صبح اٹھ کر اپنا لیپ ٹاپ وائر کے ساتھ لگایا اور انٹرنیٹ آن کر کے اپنی ای میلز چیک کیں۔ دوستوں کو ای میلز کے جواب لکھے۔ ایک آدھ اخبار پر یو ایس اے اور پاکستان کی خبریں دیکھیں۔

تب تک پال نے اُٹھ کر شاور لیا اور کچن میں جا کر میرے اور علی کے لئے انڈوں کا اور ئینٹل آملیٹ بنایا۔

ناشتے کے بعد ہم تینوں تیار ہو کر گھر سے نکلے۔ آج اتوار ہونے کی وجہ سے پاول کو کام سے چھٹی تھی۔ دراصل پاول کا شوز کا بزنس ہے۔ وہ پولینڈ سے شوز امپورٹ کرتا ہے اور روس میں مختلف کمپنیوں کو بیچتا ہے۔ اُس نے مجھے بتایا کہ اُسے ماسکو میں شوز بیچنے کی اجازت نہیں لیکن باقی روس میں وہ کسی کمپنی کو بھی شوز بیچ سکتا ہے۔

میں نے پاول کی بات سمجھنے کی کوشش کی لیکن سمجھنے سے قاصر رہا۔ یہ بھی روس کے عجیب قوانین میں سے ایک تھا۔ بزنسوں کو علاقے الاٹ کئے جاتے ہیں کہ وہ کہاں بزنس کر سکتے ہیں اور کہاں نہیں۔

پاول کے اپارٹمنٹ سے نکل کر اُس کی گاڑی میں ہم تقریباً آدھ گھنٹے میں کریملن کے سامنے تھے۔ کریملن کے بائیں طرف ریڈ اسکوائر نظر آ رہا تھا۔ ریڈ اسکوائر میں لوگ بہت بڑی تعداد میں گھوم پھر رہے تھے۔ خوانچہ فروشوں کے بہت سے بوتھ تھے جن پر لوگ خریداری کر رہے تھے۔

پاول نے کریملن کے عین سامنے گاڑی بائیں طرف جانے والی سڑک پر موڑ لی۔ اُس سڑک پر دو تین فرلانگ جانے کے بعد اُسے فٹ پاتھ پر ایک خالی پارکنگ دکھائی دی۔ اُس نے گاڑی وہاں کھڑی کر دی۔ فٹ پاتھ پر گاڑی پارک کرنا مجھے کچھ عجیب سالگا۔

لیکن اکیلے پاول نے گاڑی فٹ پاتھ پر پارک نہیں کی تھی باقی سب گاڑیاں بھی فٹ پاتھ پر پارک کی گئی تھیں۔

میں نے پاول سے گاڑیاں فٹ پاتھ پر پارک ہونے کا سبب پوچھا تو کہنے لگا سڑک کو کلیر رکھنے کے لئے یہاں گاڑیاں اِسی طرح فٹ پاتھ پر کھڑی کی جاتی ہیں۔ لیکن اِس مقصد کے لئے فٹ پاتھ اِتنے چوڑے بنائے جاتے ہیں کہ پیدل چلنے والوں کے لئے بھی بہت سی جگہ بچی رہتی ہے اور گاڑیاں بھی فٹ پاتھ پر کھڑی رہتی ہیں۔

خیر گاڑی وہاں چھوڑ کر ہم نے پیدل کریملن کی راہ لی۔ یہاں ایک چیز جو مجھے اچھی لگی یہ تھی کہ پیدل چلنے اور سڑک پار کرنے والوں کے لئے زیر زمین راستے بنائے گئے تھے۔ اس طرح نہ سڑک پر ٹریفک ڈسٹرب ہوتی تھی اور نہ پیدل چلنے والوں کو ٹریفک رُکنے کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔

ہم بھی اِسی راستے سے ہوتے ہوئے سڑک کے دوسری طرف کریملن کے سامنے پہنچ گئے۔ وہاں سیاحوں کا ایک جم غفیر تھا۔ سیاحوں میں بڑی تعداد روسیوں کی تھی لیکن بہت سے غیر ملکی بھی تھے جو کریملن دیکھنے آئے تھے۔

پہلے ہم کریملن کے داخلے کے دروازے کی طرف گئے لیکن پھر لائن کی طوالت دیکھ کر ہم نے اُس روز کریملن کے اندر جانے کا فیصلہ ترک کر دیا۔ پاول کا کہنا تھا یہ رش اتوار کا دن ہونے کی وجہ سے تھا۔

سوموار کے دن اِتنے لوگ نہیں ہوں گے پھر ہم کریملن کے اندر جائیں گے۔ آج کریملن کے بائیں طرف واقع ریڈ اسکوائر کا علاقہ دیکھتے ہیں۔

ریڈ اسکوائر میں داخلے کے لئے ایک بہت بڑا گیٹ نصب کیا گیا تھا۔ لیکن وہاں جانے کے لئے ٹکٹ کی ضرورت نہیں تھی۔ تاہم لوگوں کا انتشار تھا کہ کندھے کے ساتھ کندھے ٹکرا رہے تھے۔ مردوں ،عورتوں، لڑکوں، لڑکیوں اور بچوں کا ایک جم غفیر ریڈ اسکوائر میں داخل ہو رہا اور اِس سے باہر نکل رہا تھا۔

اِس بڑے گیٹ کے پاس ایک روسی نے اسٹالن اور دوسرے نے لینن کا سوانگ بھر رکھا تھا۔

اسٹالن دیکھنے میں بالکل اسٹالن لگ رہا تھا۔ بالکل ویسا ہی چہرہ۔ ویسی ہی چوڑی چوڑی گھنی مونچھیں اور ویسے ہی اوپر کی طرف بنے ہوئے بال۔ اُس کے جسم اور چہرے کی ساخت بھی ہو بہو اسٹالن جیسی تھی۔

یہی حال جس نے لینن کا سوانگ بھر رکھا تھا اُس کا تھا۔ اُس کے چہرے اور جسم کی ساخت بالکل لینن جیسی تھی۔ اُس کی آنکھوں کا سائز اور دیکھنے کا انداز بھی ہو بہو لینن کا تھا۔

بہت سے بچے اور بڑے اُن کے ساتھ تصویریں اتروا رہے تھے۔ جس کا جی چاہتا تصویر اتروانے کے بعد اُنہیں کچھ نذرانہ بھی دے جاتا لیکن وہ کسی سے تقاضا نہیں کر رہے تھے۔

کچھ لوگ ویسے ہی سوانگ کی وجہ سے اُن کی تصویریں اُتار رہے تھے۔ اب تصویریں اُتارنے کے لئے حقیقی لینن اور اسٹالن موجود نہیں تھے اِس لئے شائقین کے لئے اُن کی مانند دِکھنے والے ہی غنیمت تھے۔

اُن کے ساتھ تصویریں کھنچوانے والوں کا جذبہ ءشوق دیکھ کر میں سوچ رہا تھا کہ تاریخی امیجز اور تاریخی شخصیات ہر کلچر میں کتنی طاقت ور ہوتی ہیں۔ لوگ کس طرح نسل در نسل اُن کے ساتھ جڑے ہوتے

ہیں اور کس طرح مرنے کے بعد بھی لوگوں کے شعور میں وہ زندہ رہتے ہیں۔ میں نے بھی سوانگی لینن اور اسٹالن کی تصویریں اُتاریں اور ہم ہجوم میں راستہ بناتے ہوئے ریڈ اسکوائر میں داخل ہو گئے۔

ہجوم میں علی میرے آگے اور پاول میرے پیچھے چل رہا تھا۔ ہم ہجوم میں جہاں بھی گئے دونوں نے مجھے اِسی طرح کور کئے رکھا۔ یہ دونوں کی دوستی اور محبت تھی ورنہ میں نے اُن سے ایسی کوئی درخواست نہیں کی تھی۔ چونکہ روس میں ایسی جگہوں پر جرائم پیشہ لوگ بہت متحرک ہو جاتے ہیں اور جہاں کہیں اُنہیں موقع ملتا ہے اپنے شکار کی جیبوں اور پرسوں پر ہاتھ صاف کر جاتے ہیں شاید اِسی خدشے کے پیشِ نظر وہ مجھے ایسی کسی بھی اَنہونی صورتِ حال سے بچانا چاہتے تھے۔ ویسے میں نے روس جانے سے پہلے ہر طرح کی صورتِ حال کے بارے میں خاصی انفارمیشن حاصل کر لی تھی اور میں پہلے دن سے وہ سب حفاظتی تدابیر اختیار کر رہا تھا جس کی تلقین ایسے جرائم پیشہ عناصر کے طور طریقوں کو سمجھنے والوں نے کی تھی۔

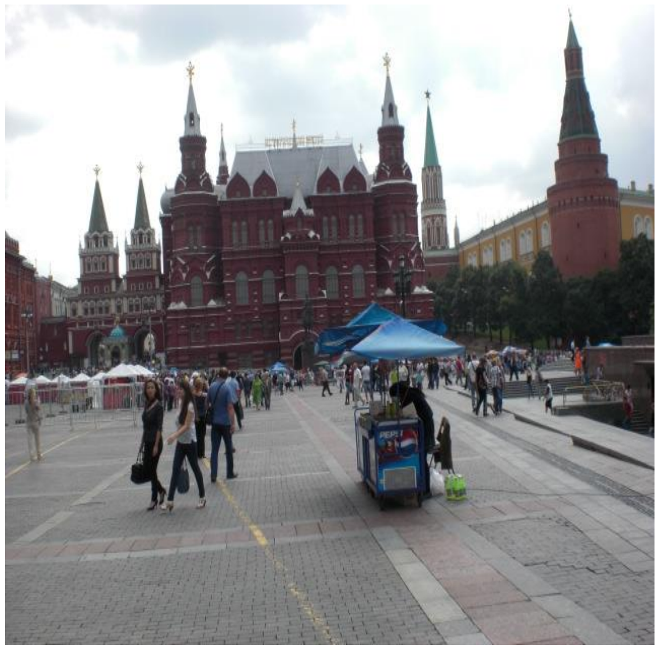

کریملن کے بائیں طرف ریڈ اسکوائر میں داخلے سے پہلے کا منظر

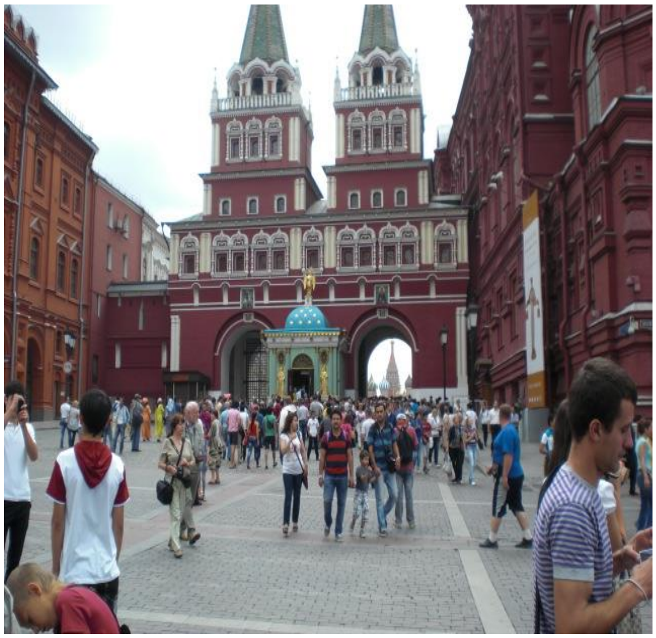

کریملن کے بائیں طرف ریڈ اسکوائر میں داخلے کا راستہ

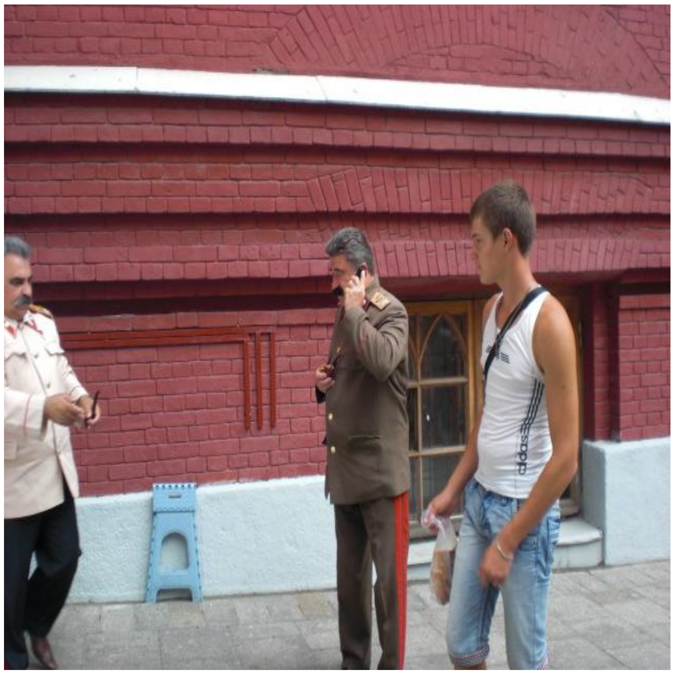

ریڈ اسکوائر کے داخلے پر اسٹالن کا سوانگ بھرے دو رُوسی

آمنے سامنے کھڑے ہیں

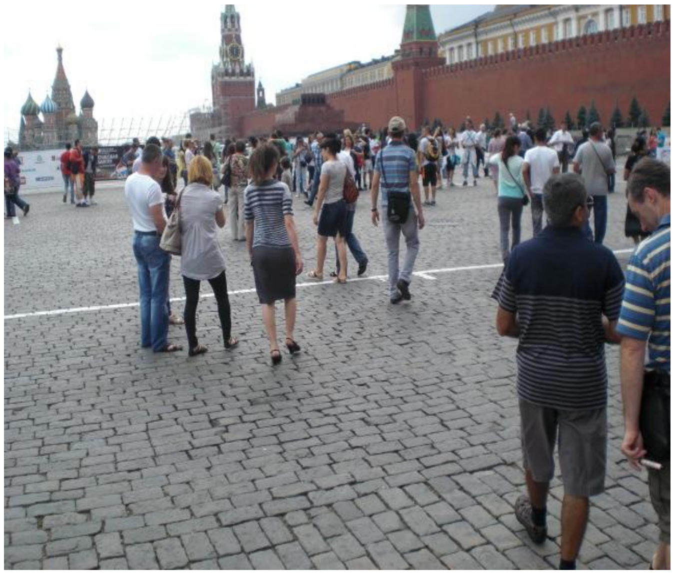

کریملن کے بائیں طرف ریڈ اسکوائر کا میدان

ریڈ اسکوائر کے دائیں طرف کریملن کی بائیں دیوار تھی اور دوسری طرف سفید پتھر کی بنی ایک دورویہ مال ہے۔ مال کو جی یو ایم یعنی گم کہا جاتا ہے۔ مال کے ریڈ اسکوائر والی طرف کیفے ہیں۔ جہاں لوگ بیٹھ کر چائے سوڈا پی سکتے ہیں اور اگر کچھ کھانا چاہیں تو کھا بھی سکتے ہیں۔ ریڈ اسکوائر کے بالکل پیچھے بسیلی کا چرچ ہے۔ بسیلی کے چرچ کو روس کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ یہ دراصل چھ سو سال پرانی چرچ کی ایک عمارت ہے جس پر بہت سے گنبد بنے ہیں۔ روس میں زیادہ تر گنبد سونے کے رنگ کے بنائے جاتے ہیں۔ لیکن بسیلی کے سب گنبدوں کے رنگ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ یہ چرچ چودھویں صدی میں سینٹ بسیلی کی قبر پر تعمیر کیا گیا تھا۔ چرچ کا ڈیزائن ایسا ہے جیسے آسمان کی طرف شعلے اُٹھ رہے ہوں۔ عیسائی دنیا میں اِس ڈیزائن کی کہیں کوئی اور مثال نہیں ملتی۔ یوں تو چرچ کا سارا اسٹرکچر ہی شعلہ نما ہے لیکن اِس کے گنبدوں کا ڈیزائن خاص طور پر اِس تاثر کو تقویت دیتا ہے۔

بسیلی کے اس چرچ کی عمارت دیکھنے میں ایک چرچ دکھائی دیتی ہے جبکہ حقیقت میں یہ عمارت تین چرچوں کا مجموعہ ہے۔ کہتے ہیں کریملن میں بیل ٹاور کی تعمیر تک یہ ماسکو کی بلند ترین عمارت تھی۔

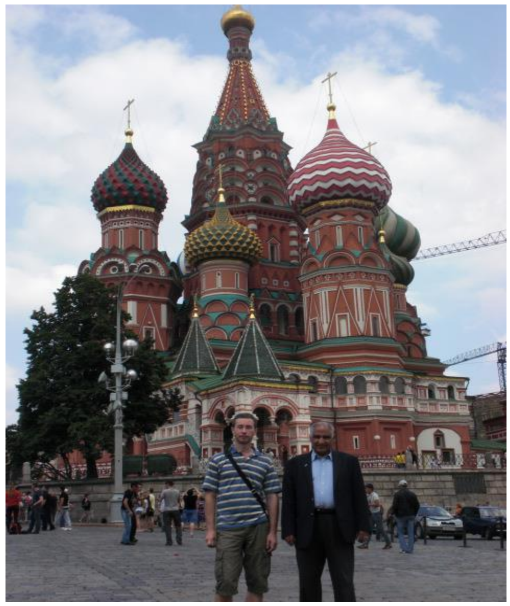

مصنف اپنے ہوسٹ پاول کے ساتھ
ریڈ اسکوائر کے عقب پر واقع بسیلی اسکوائر کے سامنے
بسیلی چرچ کو روس کی علامت کہا جاتا ہے

گم مال کا اندرونی منظر
ریڈ اسکوائر کے دائیں طرف کریملن اور
بائیں طرف گم مال واقع ہے

ہم نے بسیلی کے چرچ کی ہر طرف سے کافی تصویریں بنائیں۔ بہت سے لوگ چرچ کو دیکھنے اندر جا رہے تھے لیکن ہم نے لائن میں لگنے کی بجائے آہستہ آہستہ چلتے ریڈ اسکوائر کے ساتھ واقع مال میں چلے آئے۔ سفید پتھروں سے بنی یہ مال اپنے ڈیزائن اور وجاہت میں اپنی مثال آپ ہے۔ مال کے اندر داخل ہوتے ہی ایک عجیب نشاط اور ہلکے پن کا احساس ہوتا ہے۔ اس میں دنیا بھر کی قیمتی ترین اشیا فروخت کرنے والے اسٹوروں کی شاخیں موجود ہیں۔ کہتے ہیں چند سال قبل اِس کے موجودہ اونر نے یہ مال چھ سو ملین ڈالرز میں خریدی تھی۔

مال میں گھومنے پھرنے کے بعد ہماری اگلی منزل ارباط اسٹریٹ تھی۔ ارباط اسٹریٹ ماسکو کی معروف ترین سڑکوں میں سے ایک ہیں۔ ارباط اسٹریٹ کا اپنا ایک کلچر اور اپنا ایک ماحول ہے

ہم نے مال اور ریڈ اسکوائر کو آج کے دن کے لئے خدا حافظ کہا اور زیر زمین راستے سے ہوتے ہوئے سڑک کے دوسری طرف نکل آئے۔ ہم نے سڑک کراس کی تو پاول نے ریسٹ روم جانے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ دوبارہ سڑک پار کر کے ریسٹ روم چلا گیا جب کہ میں اور علی گاڑی کے طرف چلتے رہے۔ ابھی چند قدم ہی چلے ہوں گے کہ ہمیں ایک روسی خاتون سرخ رنگ کا ایک مشروب بیچتی دکھائی دی۔ علی نے بتایا کہ اس مشروب کا نام کباس ہے۔ یہ جو یا گندم سے بنایا جاتا ہے اور اس میں ہلکا سا نشہ ہوتا ہے۔

کباس کا ذائقہ چکھنے کی غرض سے علی اور میں نے اس خاتون سے ایک ایک گلاس کباس خریدا۔

کباس کا صرف رنگ ہی دلکش نہیں تھا یہ واقعی خوش مزہ بھی تھا۔ شوگر کی وجہ سے میں نے چند گھونٹ بھرے اور باقی یونہی چھوڑ دیا۔ میں چاہتا تھا کہ میں سارا گلاس پی جاؤں لیکن پہلے میں اِس کا اثر دیکھنا چاہتا

تھا۔ جب تک ہم نے کباس پیاپاول ریسٹ روم استعمال کر کے وہاں پہنچ گیا۔ ہم سب گاڑی میں بیٹھ گئے۔ تب تک دن کے تین بج چکے تھے۔ موسم میں ہلکی گرمی تھی۔ ارباط اسٹریٹ وہیں اوپر واقع تھی۔ ہم آگے جا کر گاڑی دوبارہ ایک فٹ پاتھ پر پارک کی اور سڑک کے نیچے بنے سڑک کراس کرنے والے راستے سے گزر کر ارباط اسٹریٹ پہنچ گے۔

جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا ہے ارباط اسٹریٹ کا اپنا ایک کلچر اور اپنا ایک ماحول ہے۔ اس کے علاوہ ارباط اسٹریٹ کی اپنی ایک تاریخ بھی ہے۔ کہتے ہیں کہ ارباط اسٹریٹ ماسکو کی قدیم ترین اسٹریٹ ہے۔ یہ پندرھویں صدی میں تعمیر کی گئی تھی اور تب سے لے کر آج تک اسے ماسکو میں ایک خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ ایک وقت میں یہاں ماسکو کی اشرافیہ کے ممبران کی رہائش گاہیں ہوا کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ بہت سے ہم آرٹسٹ اور لکھاری بھی ارباط اسٹریٹ پر رہتے رہے ہیں۔ اٹھارویں صدی میں نپولین کے قبضے کے دوران اس سڑک کو آگ لگا دی گئی جس کی وجہ سے ارباط اسٹریٹ مکمل طور پر تباہ ہو گئی۔ لیکن اسے دوبارہ تعمیر کیا گیا اور اِس کی اہمیت اِسی طرح برقرار رہی۔

ارباط اسٹریٹ کے آغاز ہی میں ہمیں ایک میکڈانلڈ دکھائی دیا۔ بہت زیادہ پیدل چلنے اور گرمی نے تقریباً ہمارا کباڑہ کر دیا تھا۔ ہم نے سوچا ارباط اسٹریٹ کے ہنگامے دیکھنے سے پہلے میکڈانلڈ میں ائیر کنڈیشنز کے نیچے بیٹھ کر اب تک کی کچھ تھکن اُتاری جائے، لنچ کیا جائے، چائے پی جائے اور پھر ارباط اسٹریٹ پر چہل قدمی کی جائے۔

ہم کوئی گھنٹہ بھر میکڈانلڈ پر بیٹھے رہے۔ جب تھکن کا احساس ختم ہو گیا تو ہم اٹھ کر سڑک پر آ گئے۔ ابھی ہم تھوڑا سا ہی چلے تھے کہ مجھے ایک گھر پر ارباط اسٹریٹ کا بورڈ دکھائی پڑا۔ میں نے بورڈ کی تصویر بنانا چاہی تو اُس سے تھوڑا ہٹ کر اُسی دیوار پر ایک اور بورڈ دکھائی دیا جس پر لکھا تھا پشکن نے فلاں سال میں

اِس گھر میں قیام کیا تھا۔ پشکن کا نام دیکھتے ہی میری آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی اور میں نے فوراً اُس بورڈ اور اُس گھر کی تصاویر بنائیں۔

پشکن رُوسی ادب کا ایک بہت بڑا رومانوی شاعر اور ڈرامہ نگار تھا۔ پشکن کا پورا نام الیکسنڈر سرگئی وچ پشکن تھا۔ وہ 6 جون 1799 کے دن ماسکو میں ایک معزز روسی گھرانے میں پیدا ہوا۔ اس کی نظموں اور ڈراموں کا ترجمہ پوری دنیا کی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ بدقسمتی سے پشکن صرف سینتیس سال کی عمر میں 10 فروری 1837 کے دن پر اسرار حالات میں انتقال کر گیا۔ اس کم عمری میں پشکن کی موت رُوسی ادب کے لئے ایک بہت بڑا سانحہ ثابت ہوا۔

یہ دیکھ کر اکہ ہم ایک عظیم روسی شاعر اور ادیب کے گھر کے باہر کھڑے تھے از حد خوشی ہوئی۔ میں نے ارباط اسٹریٹ کے سائن اور پشکن کی رہائش گاہ کے بورڈ کی کئی تصویریں بنائیں۔ تصویریں بنا کر مڑ کر دیکھا تو سڑک کے دوسری طرف چند درختوں کے نیچے ایک مرد اور ایک خاتون کا مجسمہ نصب کیا گیا تھا۔ دیکھا تو مجسمے کے نیچے لکھا تھا پشکن اور اُس کی اہلیہ نتالیہ پشکینہ۔ میں نے اُس مجسمے کی بھی کئی تصویریں اُتاریں۔

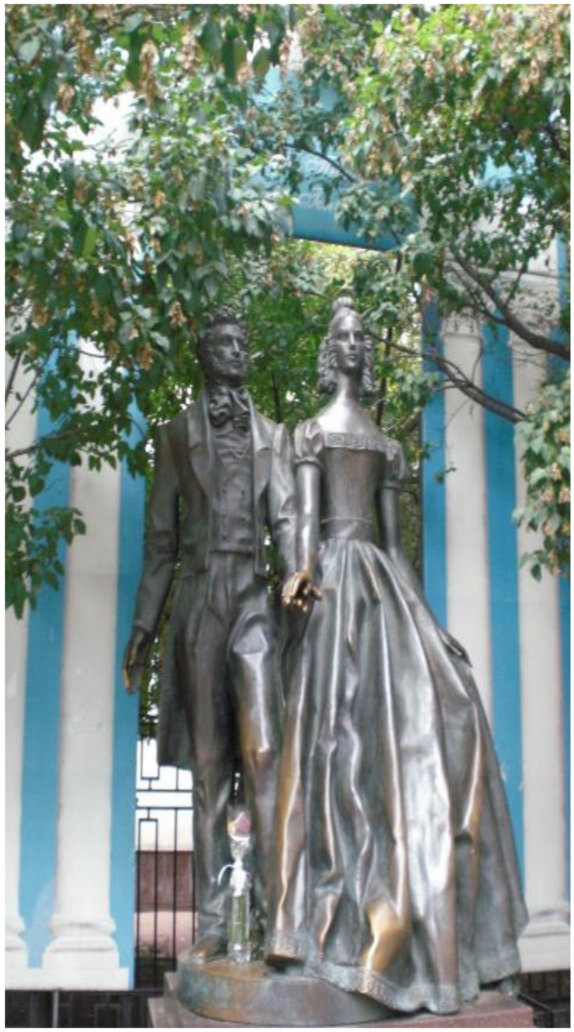

اربا ط اسٹریٹ میں لگا عظیم رُوسی شاعر اور
ڈرامہ نگار پشکن اور اُس کی بیوی کا مجسمہ

ارباط اسٹریٹ میں پشکن کے گھر کی دیوار
پر آویزاں اُس کے نام کی پلیٹ

مجھے لگا ماسکو بھی دلی اور لاہور کی طرح ایک عظیم شہر ہے۔ اِس کے گلی کوچوں میں ایسے ایسے عظیم انسانوں کے نام پڑھنے کو ملتے ہیں جن کی تحریروں نے زندگی کو کئی نئے رنگ وروپ عطا کئے۔

پشکن کے گھر کی زیارت اور مجسمے کی تصویر بنانے کے بعد ہم آہستہ آہستہ ارباط اسٹریٹ پر آگے بڑھتے رہے۔ ارباط اسٹریٹ پر ہر قدم پر کچھ نہ کچھ ایسا چل رہا تھا کہ وہاں رُکنا پڑتا تھا۔ کہیں کوئی مداری اپنے فن کے تماشے دکھا رہا تھا تو کہیں کوئی موسیقار اپنی موسیقی کی دل آویز دھنوں سے ارباط اسٹریٹ میں آنے والوں کا دل بہلا رہا تھا۔ ایک جگہ ایک سائکل والے نے اپنی سائکل کے ہینڈل میں یوں تبدیلی کر رکھی تھی کہ ہینڈل کو دائیں موڑیں تو سائکل بائیں مڑ جاتی تھی اور ہینڈل کو بائیں موڑیں تو سائکل دائیں طرف مڑ جاتی تھی۔ اُس نے بیس فٹ کے فاصلے پر دو لائینیں لگا رکھی تھیں۔ وہ وہاں کھڑے مجمع میں سب کو للکار رہا تھا کہ کوئی مائی کا لال ایک لائن سے دوسری لائن تک سائکل چلا کر دکھائے۔ اُس کے گرد ایک جم غفیر جمع تھا۔ ایک کے بعد ایک منچلا کوشش کر رہا تھا کہ سائکل چلائے۔ لیکن ہر کوئی فیل ہو رہا تھا۔ جو فیل ہوتا چند سکے اُس سائکل والے کی ذہانت کے اعتراف کے طور پر اُس کی نذر کر جاتا۔ ہم تھوڑی دیر وہاں کھڑے دیکھتے رہے لیکن کوئی بھی سائکل چلانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ جس نے کوشش کی فیل ہوا۔

وہاں سے آگے چلے تو ایک شخص تانبے کی تاروں سے بنا ایک کھلونا بیچ رہا تھا۔ تار کے ٹکڑوں کو اِس طرح جوڑا گیا تھا کہ اِن تاروں کے ٹکڑوں سے جیومیٹری کی کوئی بھی شکل بنائی جا سکتی تھی۔ چاہو تو دائرہ بنالو۔ چاہو تو مثلث بنالو۔ چاہو تو بیضوی شکل دے دو۔ وہ یہ کھلونا تیس روبلز میں ایک بیچ رہا تھا۔ کئی بچوں والی ماؤں نے وہ کھلونا خرید کر اپنے بچوں کو دیا۔

غرض ارباط اسٹریٹ ایسے تماشوں سے بھری پڑی تھی۔ اسٹریٹ کے ارد گرد بنی دوکانوں کے کاروبار چل رہے تھے اور اسٹریٹ کے درمیان ایسے شعبدہ بازوں کی چیزیں بھی بک رہی تھیں۔ گویا ایک میلے کا سماں تھا۔ جو ہفتے کے ساتوں دن ارباط اسٹریٹ پر جاری رہتا ہے۔

آپ اگر کبھی ماسکو جائیں تو ارباط اسٹریٹ ضرور جائیں۔ ارباط اسٹریٹ دیکھے بغیر ماسکو کا ٹرپ مکمل نہیں ہو سکتا۔

ارباط اسٹریٹ کی سیاحت سے فارغ ہوئے تو شام کے سائے ماسکو پر گہرے ہوتے جارہے تھے۔ پاول نے بتایا کہ اِس وقت دریائے ماسکو میں بحری جہاز پر شہر کا ٹور دیا جاتا ہے۔

ہم اگرچہ دن بھر چلنے پھرنے سے خاصے تھکے ہوئے تھے اس کے باوجود اگلے بیس پچیس منٹ میں گاڑی چلاتے ماسکو اسٹیٹ یونیورسٹی کے سامنے دریائے ماسکو کے کنارے جا پہنچے۔ یہاں دریا کے ایک طرف ماسکو اسٹیٹ یونیورسٹی اور دوسرے طرف گورکی پارک کا عقبی علاقہ ہے۔

بدقسمتی سے جب ہم دریائے ماسکو تک پہنچے اُس شام کا آخری جہاز روانہ ہو چکا تھا۔ تھکاوٹ کی وجہ سے میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اُس روز کا آخری جہاز جا چکا تھا۔ ورنہ اب اُس دن کسی نئی مہم کا حوصلہ نہیں تھا۔

پاول نے اُس شام کے لئے کئی اور آئیڈیاز پیش کئے لیکن میں نے اب اپارٹمنٹ واپس جانے کا عندیہ دیا۔ میری خواہش کے احترام میں پاول نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ہم اُس کے اپارٹمنٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔

دریاے ماسکو سے گاڑی چلی تو میں نے گاڑی کی کھڑکی سے دیکھا ہمارے عقب میں دریا کے کنارے چند نوجوان روسی جوڑے اپنی محبت تازہ کرنے کے عمل میں مصروف تھے۔ کوئی اُن کے خوبصورت لمحوں میں مخل نہیں ہو رہا تھا۔ مجھے روسی معاشرے کی یہ آزادی اچھی لگی۔

رُوس میں تیسرا دن

ہم نے ماسکو میں دوسرا دن بہت بھرپور گزارا تھا۔ کل ہم نے ریڈ اسکوائر اور ارد ھر گرد کے علاقے کی سیاحت کی تھی۔ روس کی علامت بسیلی کا چرچ اور کریملن کے پہلو میں واقع مال کی سیاحت کی تھی۔ ارباط اسٹریٹ گئے تھے اور دریائے ماسکو اور اسٹیٹ یونیورسٹی کے علاقے میں گھومے پھرے تھے۔ لیکن کل ہمیں کریملن کے اندر جانے کا موقع نہیں ملا تھا۔

آج پاول صبح ہی صبح اٹھ کر اپنے دفتر چلا گیا تھا۔ میں بھی جلد ہی اُٹھ گیا تھا۔ علی نو بجے کے قریب بیدار ہوا۔ علی کے اٹھنے سے پہلے میں نہا دھو کر آج کے دن کے لئے تیار ہو چکا تھا۔

علی نے بیداری کے بعد غسل کیا کپڑے بدلے اور ناشتہ تیار کیا۔ ہم دونوں ناشتہ کرکے اپارٹمنٹ سے نکلے اور چند منٹ کے فاصلے پر واقع میٹرو اسٹیشن پہنچے۔ میٹرو پکڑ کر ہم آج پھر کریملن گئے۔

ہمارے کریملن پہنچنے تک ساڑھے دس بج چکے تھے۔ آج سوموار کا دن تھا۔ اِس لئے کریملن میں کل کی نسبت رش قدرے کم تھا۔ پھر بھی کریملن کے اندر جانے والوں کی ٹکٹ خریدنے کے لئے ایک لمبی قطار لگی تھی۔ ہم نے قطار کے اندر کھڑے ہو کر 13 سو روبلز کے دو ٹکٹ خریدے اور کریملن کے اندر چلے گئے۔ کریملن کے اندر داخل ہوتے ہی پہلے دائیں ہاتھ ایک ایگزبیشن ہال تھا۔ جس میں ہر وقت کوئی نہ کوئی ایگزبیشن چلتا رہتا ہے۔ اس روز بھی ایگزبیشن ہال کے اندر کیوبا کا ایگزبیشن چل رہا تھا۔

ہم ایگزبیشن میں وقت ضائع کئے بغیر کریملن کے اندر تاریخی مقامات دیکھنا چاہتے اور اس کے بعد کریملن کے باہر ارد گرد باقی رہ جانے والے مقامات کی سیاحت کرنا چاہتے تھے۔

چنانچہ ہم ایگزبیشن ہال میں داخل ہوئے بغیر آگے چلے گئے۔ ایگزبیشن ہال کے ساتھ ہی آگے مختلف چرچ بنے ہیں۔ ان چرچوں کی وجہ سے کریملن کے اندر اس ایریئے کو کیتھڈرل اسکوائر کہا جاتا ہے۔

کتھیڈرل اسکوائر میں سب سے پہلے جس تاریخی چرچ کی خوبصورت عمارت واقع ہے اُس دو مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ کچھ لوگ اسے کیتھڈرل آف ڈرمیشن کہتے ہیں جب کہ کچھ لوگ اسے کیتھڈرل آف اسمپشن کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس چرچ کی عمارت پندرھویں صدی میں تعمیر کی گئی تھی۔ سویت انقلاب سے پہلے سب زاروں کی رسم تاجپوشی اسی چرچ میں ادا کی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ ان کی شادی کی رسومات بھی اسی چرچ میں ادا کی جاتی تھیں۔

چرچ کے اندر روس کے کچھ نامور ترین مجسمہ سازوں کے بنائے ہوئے مریم کے مجسمے رکھے گئے تھے جنہیں اب وہاں سے اٹھا کر میوزیم میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ چرچ کے اندر معروف پینٹروں کی بنائی گئی تصاویر ہیں۔ جو اب بھی چرچ کے اندر موجود ہیں۔

کریملن کے اندر کیتھڈرل اسکوائر پر واقع چرچ آف ڈرمیشن

چرچ آف ڈرمیشن سے نکل کر آگے بڑھیں تو چند قدم کے فاصلے پر کیتھڈرل اسکوائر میں ہی ایک اور چرچ واقع ہے جس کا نام اننسی ایشن کیتھڈرل ہے۔ اننسی ایشن چرچ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ روسی زاروں کے لئے پرائیوٹ سروس کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ اپنے خوبصورت فرنٹ اور سونے کے بنے گنبدوں کی وجہ سے دیکھنے میں اِس چرچ کی عمارت انتہائی دیدہ زیب دکھائی دیتی ہے۔

اننسی ایشن چرچ سے پہلے یہاں ایک چرچ تھا جسے ایوان نامی زار نے گرا کر موجودہ چرچ کو اِس کی جگہ تعمیر کرایا تھا۔

پرانے چرچ کو گرائے جانے کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ جب زار روس ایوان نے چوتھی شادی کی تھی تو چرچ کے آرتھوڈاکس پادریوں نے چرچ میں اُس کے لئے مذہبی وجوہات کی بنیاد پر سروس بند کر دی تھی۔ اُس نے اِس چرچ کو گرا کر اِس کی جگہ موجودہ چرچ تعمیر کرایا تھا۔ اِس چرچ کے اندرونی حصے کو بھی رُوس کے چند نامور مصوروں نے اپنے فن پاروں سے سنوارا۔ ان مصوروں میں اینڈریو ربلیو، تھیپین دی گریک اور پورخور شامل ہیں۔

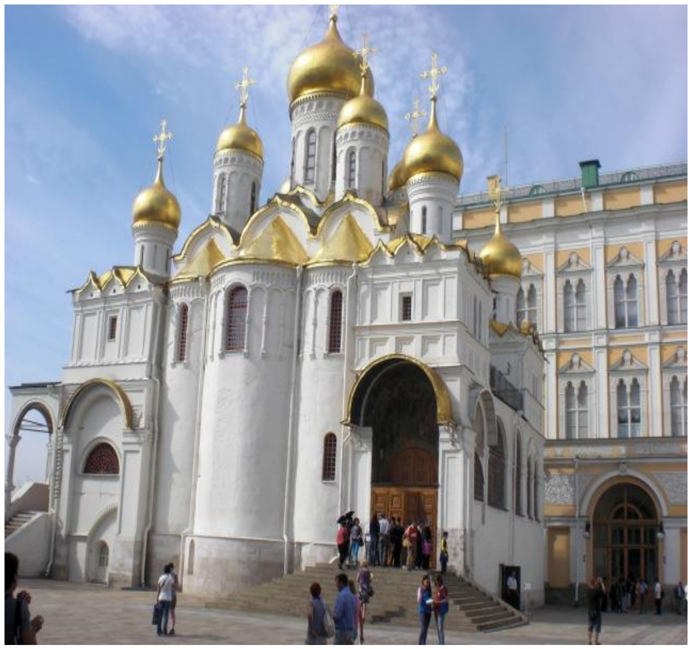

کریملن کے اندر کیتھڈرل اسکوائر پر واقع اننسی ایشن چرچ

ایوان دی گریٹ کی چار شادیوں اور کیتھیڈرل اسکوائر پر واقع اننسی ایشن چرچ کا ذکر ہوا ہے تو کیتھڈرل اسکوائر میں واقع ایک اہم ٹاور کا ذکر بھی غیر ضروری نہیں ہو گا۔ اس ٹاور کا نام ہے ایوان دی گریٹ بیل ٹاور۔ یہ ٹاور کریملن کی نگرانی کے تعمیر کیا گیا تھا۔

کہتے ہیں کہ چھ سو سال تک ماسکو میں اس سے بلند عمارت تعمیر کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس میں نصب گھنٹی کو بجانے کے لئے کم از کم دو درجن گھنٹیاں بجانے والوں کی ضرورت ہوتی تھی۔

نپولین نے جب ماسکو فتح کیا تھا تو کہتے ہیں کہ یہ اکلوتی عمارت تھی اس نے جسے گرانے کا حکم دیا تھا لیکن بوجوہ وہ اسے گرانے میں ناکام رہا۔ اِس وجہ سے روسی اِس ٹاور کو اپنی تاریخ کے تلخ ترین تجربے کے دوران مزاحمت کی علامت بھی قرار دیتے ہیں۔

یاد رہے کہ ٹالسٹائے کا معروف ناول وار اینڈ پیس بھی ماسکو پر نپولین کے حملے اور قبضے کے پس منظر میں لکھا گیا تھا۔

کہتے ہیں کہ اس ٹاور پر نصب گھنٹی دنیا کی سب سے بڑی گھنٹی تھی جسے اب نیچے اتار دیا گیا ہے۔ نیچے اتارتے وقت یہ گھنٹی ایک طرف سے ٹوٹ گئی تھی اور اس کے نیچے آ کر ایک شخص مر بھی گیا تھا۔

اب وہ گھنٹی کریملن میں بیل ٹاور کے پاس گراونڈ پر رکھی ہے۔ سیاح بہت شوق کے ساتھ یہ گھنٹی دیکھتے اور اس کے ساتھ تصویریں بنواتے ہیں۔ اس گھنٹی کی علاوہ اسی کیتھڈرل اسکوائر پر سترھویں صدی کی ایک توپ اور توپ میں استعمال ہونے والے گولے بھی سیاحوں کی خصوصی دلچسپی کا مرکز بنتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ دنیا کی سب سے بڑی توپ ہے۔

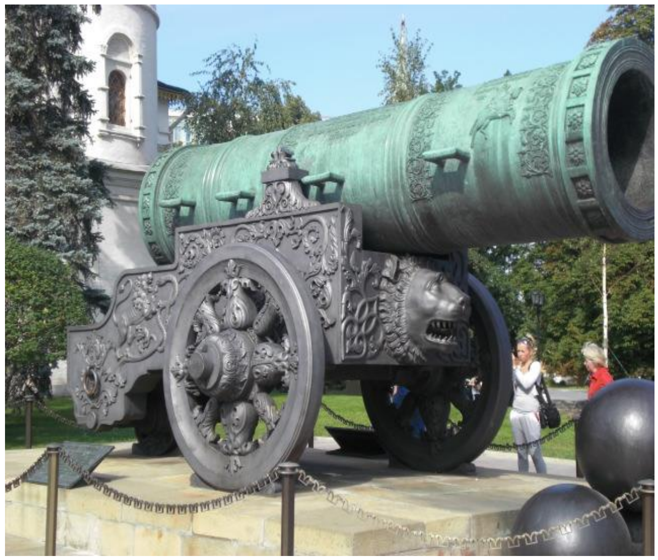

بیل ٹاور کے باہر رکھی توپ

بیل ٹاور سے اتاری گئی بیل۔ جو ٹاور سے
اُتارتے ہوئے ٹوٹ گی تھی۔

کریملن میں کیتھڈرل اسکوائر پر واقع عمارات دیکھتے ہوئے آگے بڑھے تو کریملن کی عقبی فینس دکھائی دی۔ چہل قدمی کرتے وہاں تک پہنچے تو نیچے دریاے ماسکو بہتا دکھائی دیا۔ وہاں ایک روڈ بنی تھی جو کہ کریملن کے پرائیوٹ رہائشی حصے تک چلی گئی تھی۔

اسی علاقے میں روس کے صدر کی رہائش گاہ اور دفاتر واقع تھے۔ اس طرف کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ وہاں نگرانی کے لئے ایک فوجی کھڑا تھا۔ ہم کچھ کریملن کی عقبی فینس کے ساتھ کھڑے ہو کر دریائے ماسکو کا منظر دیکھتے رہے اس کے بعد کیتھڈرل اسکوائر سے ہوتے ہوئے کریملن سے باہر نکل آئے۔ کریملن سے باہر نکل کر ہم کریملن کے سامنے واقع زیر زمین مال میں چلے گئے۔ یہ تین منزلہ مال تھی۔ جس میں تقریباً سبھی بڑے چین اسٹور موجود تھے۔ سب سے نیچے لیول پر ریستوران واقع تھے۔ ہم لفٹ میں بیٹھ کر ریستورانوں والے فلور پر پہنچے۔ وہاں ہمیں ایک روسی ریستوران دکھائی دیا۔ ہم نے اس ریستوران سے اپنے لئے روسی کھانے کی دو ڈشیں خرید کر کھائیں اور لفٹ میں بیٹھ کر مال سے باہر نکل آئے۔

مال سے باہر نکل کر کریملن کے سامنے مین سڑک پر آئے تو وہاں دائیں ہاتھ پر ہمیں رُوسی پارلیمنٹ کی عمارت دکھائی دی۔

جب سوویت یونین ٹوٹ رہا تھا اور اُس کی کوکھ سے فیڈریشن آف رُوس جنم لے رہی تھی اِسی پارلیمنٹ سے بورس یلسن نے سوویت یونین کے خلاف اعلان بغاوت بلند کیا تھا۔ اسی پارلیمنٹ کے سامنے لوگ ٹینکوں پر چڑھے تھے اور بورس یلسن نے ایک ٹینک پر کھڑے ہو کر رُوسیوں کے جم غفیر سے خطاب کیا

تھا۔ ہم نے پارلیمنٹ کی عمارت کی سامنے کھڑے ہو کر اس کی چند تصویریں بنائیں اور اسی سمت میں سڑک پر چلتے رہے۔

کریملن کے سامنے واقع پارلیمنٹ کی بلڈنگ

پارلیمنٹ کے بلڈنگ کے سامنے چلتے ہوئے ہم کچھ آگے گئے تو وہاں پر ماسکو کے معروف ترین تھیٹر واقع ہیں۔ انہی تھیٹرز میں سے دنیا کا مشہور ترین تھیٹر بالشوئی واقع ہے۔

بالشوئی کی عمارت درمیان میں واقع ہے جبکہ اس کے ارد گرد کئی اور تھیٹر ہال ہیں جو کہ بالشوئی کا ہی حصہ ہیں۔ جب سیزن شروع ہو تا ہے تو ان سارے تھیٹروں میں ایک ہی وقت میں کئی پلے ایک ساتھ دکھائے جاتے ہیں۔

بالشوئی کا لغوی مطلب ہے بہت بڑا۔ بالشوئی کی مین بلڈنگ روس کی تاریخ میں کئی بار ڈھائی اور تعمیر کی گئی۔

آخری بار اس کی تعمیر 1805 میں ماسکو میں لگنے والی بڑی آگ کے بعد تعمیر کی گئی تھی جو کہ 1825 میں مکمل ہوئی۔

اگر آپ ایک سو روبلز کا بینک نوٹ دیکھیں تو اُس پر آپ کو بالشوئی کی تصویر دکھائی دے گی۔ اس عمارت کو ماسکو میں لینڈ مارک کا درجہ حاصل ہے۔ خود روسی اس میں اوپرا یا بیلے دیکھنے کو اپنے لئے بہت بڑا اعزاز سمجھتے ہیں۔ بد قسمتی سے میری سیاحت کے دوران میں ہال میں اوپرا یا بیلے نہیں چل رہا تھا اس لئے مجھے اندر سے یہ عمارت دیکھنے کا اتفاق نہ ہو سکا۔ اس لئے میں اندر سے اس کی تصویریں نہ بنا سکا لیکن میں نے سامنے سے اس کی کئی تصویریں بنائیں۔ آخری بار اس عمارت کی تزئین 2011 میں ہوئی تھی۔ کہتے ہیں اس کی تزئین پر 680 ملین ڈالر خرچ ہوئے تھے۔

جس سڑک پر بالشوئی واقع ہے اسی سڑک پر آگے جا کر چند بلاک کے فاصلے پر کے جی بی کی عمارت واقع ہے۔

علی نے کے جی بی کا ذکر کیا تو میں نے کہا لگے ہاتھوں کے جی بی کی بلڈنگ بھی دیکھ لی جائے۔ کے جی بی کے بلڈنگ کے قریب جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اس لئے ہم نے سامنے والی سڑک پر کھڑے ہو کر کے جی بی کی بلڈنگ کی چند تصویریں بنائیں اور پھر کریملن کی طرف واپس آ گئے۔ کیونکہ وہاں سے ہمیں میٹرو پکڑ کروے خی اینکا ایگزبیشن پارک جانا تھا۔

پاول نے ہمیں کہہ رکھا تھا کہ اگر ہم کریملن سے میٹرو پکڑ کر وہاں آ جائیں تو وہ ہمیں وہاں آن ملے گا اور باقی کا دن اکٹھے گھومیں پھریں گے۔

کریملن سے دو بلاک کے فاصلے پر واقع
مشہور زمانہ بالشوئی تھیٹر

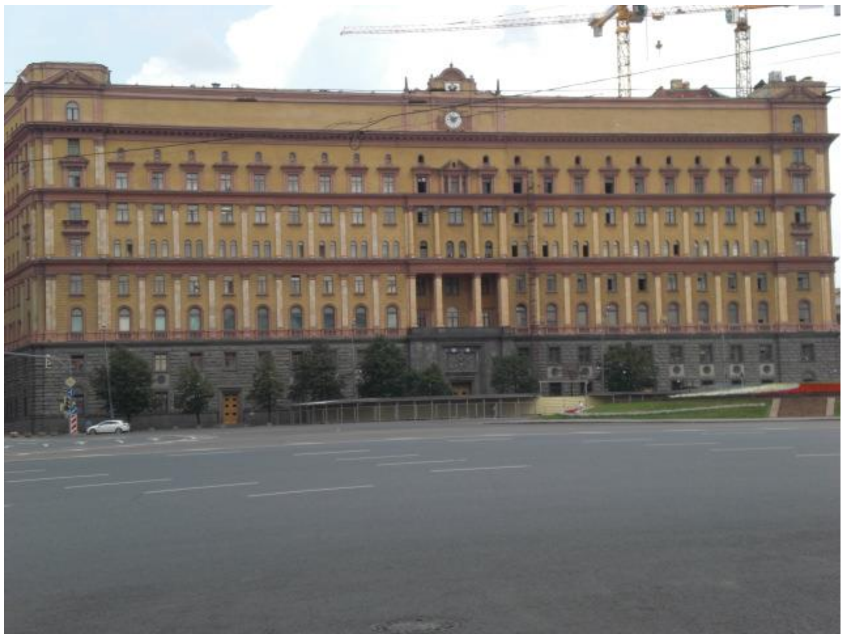

کریملن سے تقریباً چھ بلاک دور واقع کے جی بی کی عمارت

چنانچہ ہم کریملن کے میٹرو اسٹیشن سے میٹرو پر سوار ہو کر وے خی اینکا ایگزبیشن پارک پہنچے تو وہاں لگتا تھا کہ سارا ماسکو سیر و تفریح کے لئے کھنچ آیا ہے۔ علی نے پاول کو کال کی لیکن وہ ابھی تک اپنے دفتر میں مصروف تھا۔ اس لئے ہم اس کا انتظار کئے بغیر وے خی اینکا ایگزبیشن پارک کی طرف نکل کھڑے ہوئے۔ پارک میٹرو اسٹیشن سے زیادہ دور نہیں۔ وے خی اینکا ایگزبیشن پارک کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں روس کے خلائی پروگرام کی یادگاریں ہیں۔ اس کے بعد وے خی اینکا ایگزبیشن پارک کا اصل حصہ شروع ہوتا ہے۔

روس کے خلائی پروگرام کی یادگار کے طور پر شروع میں ایک گرے رنگ کی انتہائی چمک دھات کا ایک انتہائی اونچا تاثراتی مینار بنایا گیا ہے جو خلا میں میں اوپر اٹھتے ہوئے ایک راکٹ اور راکٹ کے پیچھے دھویں کی ایک طویل لکیر کا تاثر دیتا ہے۔

مینار کے پیڈسٹل کے ایک طرف اُن روسی سائنسدانوں کے باہمی مشورے کرتے ہوئے مجسمے بنائے گئے ہیں جو خلائی پروگرام کو عملی شکل دینے کے بارے میں سوچتے دکھائی دیتے ہیں۔ پیڈسٹل کے ساتھ دوسری طرف روس کے خلائی پروگرام کے بانی شیولووسکائی کا مجسمہ بنایا گیا ہے۔ شیولووسکائی کے مجسمے کے سامنے کچھ فاصلہ چھوڑ کر مجسمے کے دائیں اور بائیں طرف ان خلا بازوں کے مجسمے بنائے گئے ہیں جنھوں نے اس پروگرام میں حصہ لیتے ہوئے خلا میں سفر کیا اور دنیا میں خلائی پروگرام کے بانی قرار پائے۔ ان مجسموں میں سب سے پہلے مرد روسی خلاباز یوری گریگن اور خاتون روسی خلا باز ویلنٹینا کریشکوواکا مجسمہ بھی نصب ہے۔

وے خی اینکا اکیز بیشن پارک کا یہ حصہ صرف روسی ہی نہیں خلائی تحقیق کی انسانی تاریخ کا انتہائی اہم مقام ہے۔

آج انسان مریخ پر جانے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ امریکی صدر بارک اوباما نے اعلان کیا ہے کہ امریکہ 2025 تک پہلے انسان کو مریخ پر اتارے گا۔ اس سلسے میں پہلے ہی کئی تحقیقاتی مشن مریخ پر بھجوائے گئے ہیں جو کہ مریخ پر زندگی کے امکانات کی تحقیق کر رہے ہیں۔

لیکن خلائی تحقیق کب کیسے اور کس طرح شروع ہوئی وے خی اینکا اکیز بیشن پارک کے اِس حصے میں اُس کی تاریخ محفوظ ہے۔ اُن سب لوگوں کے مجسمے بھی موجود ہیں جنہوں نے اس تحقیق کو عملی جامہ پہنایا۔

یہ عظیم لوگ چونکہ سوویت یونین سے تھے ہو سکتا ہے کہ بین الاقوامی دنیا سوویت یونین کے خاتمے کے وجہ سے ان کی خدمات کی طرف توجہ نہ دے لیکن سچ یہی ہے کہ ان عظیم لوگوں کی وجہ سے کئی دہائیوں تک سوویت یونین کو خلائی پروگرام میں امریکہ پر سبقت حاصل رہی۔ اگر یہ عظیم لوگ سوویت یونین کے خلائی پروگرام میں اس قدر جانفشانی اور مہارت کا مظاہرہ نہ کرتے تو شاید انسان ابھی مریخ پر قدم رکھنے کے خواب دیکھنے کی جسارت نہ کرتا۔ میں ان عظیم انسانوں کے مجسموں کو دیکھ رہا تھا اور میرے ذہن میں ان کے کارناموں کی ریل چل رہی تھی۔

میں نہیں جانتا کہ اب روس کا خلائی پروگرام کس حال میں ہے۔ لیکن وے خی اینکا اکیز بیشن پارک میں مجسموں کی شکل میں محفوظ یہ تاریخ دل چسپ بھی ہے اور سبق آموز بھی۔

وے خی اینکا پارک میں روس کے خلائی پروگرام کی یادگار

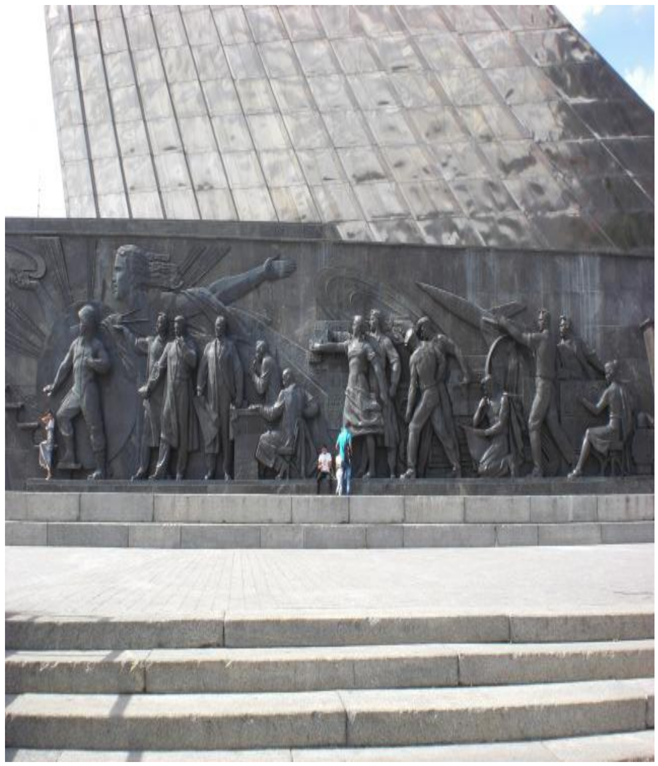

وے خی اینکا ایگزبیشن پارک میں خلائی پروگرام کی یادگار
کے پیڈسٹل پر بنے روسی سائنسدانوں کے مجسمے

وے خی اینکا ایگزبیشن پارک میں خلائی پروگرام کی یادگار
کے ساتھ بنے روس کے خلائی پروگرام کے
بانی سائنسدان کا مجسمہ

وے خی اینکا ایگز بیشن پارک میں خلائی پروگرام کے تاریخی مجسمے دیکھ کر ہم پارک کے دوسرے حصے کے طرف آگے بڑھے تو وہاں بھی ویسی ہی رونق تھی۔ رُوسی اور غیر رُوسی بڑے اور بچے پارک کی سیر کر رہے تھے اور ساتھ ساتھ پارک میں سووت دور کی محفوظ شدہ تاریخ کے مظاہر بھی دیکھ رہے تھے۔

وے خی اینکا ایگز بیشن پارک کے اس حصے میں بہت سے پاویلینز بنے ہوئے تھے۔ ہر پاویلین سوویت یونین کی ممبر ریاستوں میں سے کسی ایک سے منسوب تھا۔ سوویت یونین کے زمانے میں یہ پاویلین ان ریاستوں کی ماسکو میں سرگرمیوں کا مرکز ہوتے تھے۔

یہ پاویلین اتنے بڑے رقبے میں پھیلے ہوئے تھے کہ وے خی اینکا ایگز بیشن پارک میں پیدل چل کر سارے پاویلین دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ پارک کے دروازے پر رکشا نما سیاحتی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ جو چند سو روبل لے کر سارے پارک کی سیاحت کراتے تھے۔

ایسے ہی ایک رکشہ گاڑی پر ایک خوبصورت روسی لڑکی ڈرائیور سیٹ پر بیٹھی تھی۔ علی نے کہا کہ ہم یہ رکشہ گاڑی رینٹ کرتے ہیں۔ اُس نے اُس لڑکی سے کرائے کے بارے میں بات کی۔ اُس نے ایک ہزار روبل کرایہ بتایا۔ علی نے پوچھا سارے پارک کی سیاحت میں کتنا وقت لگے گا۔ اُس نے بتایا تقریباً ایک گھنٹہ لگ جائے گا۔

میں پیدل چلتے چلتے تھک چکا تھا۔ میں نے کہا ٹھیک ہیں ہزار روبل کچھ زیادہ نہیں ہیں۔ اگر یہ ایک گھنٹہ تک سارے پارک میں پھیلے پاویلین ہمیں دکھائے گی تو اسی کے ساتھ چلتے ہیں۔

جیسے ہی علی نے لڑکی کو رکشہ گاڑی رینٹ کرنے کا عندیہ دیا وہ چھلانگ لگا کر ڈرائیور سیٹ سے اتری اور تھوڑی دور کھڑے ایک روسی سے بولی کہ وہ ہمیں پارک میں پھیلے پاویلینز کی سیر کرادے۔

علی اور میں بے تحاشا ہنسنا شروع ہو گئے۔ لڑکی نے کہا کہ ہم لوگ ہنس کیوں رہے ہیں۔ علی نے کہا کہ ہم نے رکشہ گاڑی اس کی وجہ سے رینٹ کی تھی لیکن اس نے ہمیں اور گاڑی کو کسی اور کے حوالے کر دیا ہے۔ وہ بھی ہماری بات سن کر ہنس دی۔ اُس نے کہا وہ صرف کرایہ طے کرتی ہے باقی کام دوسرے ڈرائیور کرتے ہیں۔

وے خی اینکا ایگزبیشن پارک کے درمیان میں ایک جگہ سوویت یونین کی ہر ممبر ریاست کا ایک ایک گولڈن سمبل مجسمہ نصب ہے جن کے گرد چلتے فوارے ایک عجیب سماں پیدا کرتے ہیں۔

وخے اینکا ایگزبیشن پارک میں سابقہ سوویت ریاستوں
کی نمائندگی کرنے والے مجسمے

وخے اینکا ایگزبیشن پارک میں ایک سابقہ

سوویت ریاست کا پاویلین

رکشہ گاڑی والا ڈرائیور روسی خاصہ باتونی تھا۔ وہ جب تک ہمیں پارک میں ہر ریاست کی پاویلین کے سامنے گھماتا رہا اُس کی زبان مسلسل چلتی رہی۔ علی مسلسل اُس کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ جب کسی ریاست کے پاویلین کے بارے میں کسی خاص بات کا اُسے پتہ چلتا تو وہ میرے ساتھ شئیر کرتا۔

کوئی گھنٹہ بھر وے خی اینکا ایگزبیشن پارک میں پھرنے کے بعد جب رکشہ گاڑی والے نے ہمیں پارک کے دروازے پر اُتارا تو سورج بڑی تیزی سے ماسکو کے مغربی آسمان پر غروب ہو رہا تھا۔

کافی دیر تک وے خی اینکا ایگزبیشن پارک میں گھومنے کے بعد ہمارا انرجی لیول کافی حد تک نیچے آرہا تھا اس لئے ہم نے پارک کے دروازے پر ایک آئیس کریم والے سے ایک ایک آئس کریم خریدی اور واپس چلتے میٹرو اسٹیشن پہنچے۔ پاول ابھی تک اپنے دفتر میں تھا۔

گھر جانے سے پہلے علی سے میں پوچھا کہ اس جگہ سے اور کونسی اہم جگہ قریب واقع ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ گورکی پارک یہاں سے چند اسٹاپ دور ہے۔ گورکی پارک سے دریائے ماسکو میں بحری جہاز ماسکو کے ٹرپ پر لے جاتے ہیں۔ گورکی پارک جانا بھی میری ترجیحات کی فہرست پر تھا۔ میں نے کہا چلو لگتے ہاتھ گورکی پارک بھی ہوتے جاتے ہیں۔

چنانچہ ہم وے خی اینکا ایگزبیشن پارک سے میٹرو لے کر گورکی پارک پہنچے۔ روسی ادب میں کے کئی ادبی فن پاروں میں گورکی پارک کا ذکر ہے۔ بدقسمتی سے انیسویں اور بیسویں صدی کے جن ادبی فن پاروں میں جس گورکی پارک کے ماحول کی نقشہ کشی کی گئی ہے موجودہ گورکی پارک ویسا نہیں۔ بے ہنگم قسم کی ترقی نے گورکی پارک کے فطرتی ماحول کو خاصی حد تک متاثر کیا ہے۔

پارک کے عقب میں دریائے ماسکو بہتا ہے۔ یہاں دریا کے کنارے بیٹھنے کے لئے سیڑھیاں بنی ہیں۔ جہاں نوجوان لڑکے لڑکیاں بیٹھے خوش گپیاں کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

ہم نے جہاز کے اسٹیشن سے اگلے ٹرپ کی انفارمیشن لی تو پتہ چلا کہ اُس روز کا آخری جہاز پندرہ منٹ پہلے روانہ ہو چکا ہے۔ وہیں پاس ہی روس کی وہ خلائی شٹل پارک تھی جس میں خلاباز خلا میں جایا کرتے تھے۔ روس کے پہلے خلاباز یوری گریگن بھی اس شٹل میں خلا کا سفر کر چکے تھے۔

تھوڑی دیر گورکی پارک میں بیٹھنے کے بعد ہم نے پارک کو خدا خافظ کہا اور آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے میٹرو اسٹیشن آئے۔ میٹرو اسٹیشن کی طرف چلتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ میٹرو کو بھی ماسکو کی زندگی میں کتنی اہمیت حاصل ہے۔ اسٹالن نے ماسکو کے رہنے والوں کو سفر کرنے کا ایک ایسا وسیلہ دیا جو ستر اسی برس گزرنے کے باوجود ان کی خدمت انتہائی سرعت کے ساتھ سرانجام دے رہا ہے۔ مجھے چین، جاپان، یورپ اور امریکہ کی زیر زمین ٹرینوں میں سفر کرنے کا موقع ملا ہے لیکن ماسکو کا زیر زمین ٹرینوں کا نظام انتہائی فعال ہے۔ پرانا نظام ہونے کی وجہ سے بعض ٹرینوں میں شور کافی زیادہ ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود ان کی فعالیت کا کوئی جواب نہیں۔

ماسکو کے بعض زیر زمین میٹرو اسٹیشن بھی آرٹ کے نمونوں کا شاہکار ہیں۔ کئی اسٹیشنوں پر مجسمہ سازی کے بہترین نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں اور کئی اسٹیشنوں پر آرٹ کے ایسے ایسے نمونے دکھائی دیتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ماسکو کے رہائشی اپنے میٹرو اسٹیشن پر بہت فخر کرتے ہیں۔

ایک دن پاول سے میٹرو کے بارے میں بات ہوئی تو وہ بڑے فخر سے کہنے لگا کہ اُن کی میٹرو کا کافی حصہ دریائے ماسکو کے نیچے ہے۔ میں نے اُسے بتایا کہ سان فرانسسکو میں انڈر گراؤنڈ ٹرین کئی میل تک سمندر کے نیچے چلتی ہے۔ اُسے میری بات پر یقین نہ آیا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔

لیکن اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ماسکو کی میٹرو جیسی فعالیت میں نے کم ملکوں میں دیکھی ہے۔ ایک گاڑی اسٹیشن سے چھوٹتی ہے تو دوسری داخل ہو جاتی ہے۔ آپ کو دوسری گاڑی کے لئے بالکل انتظار نہیں کرنا پڑتا۔

بہر حال علی اور میں نے آج کا دن پاول کے بغیر ماسکو کی سیاحت میں گزارا۔ جب ہم دونوں ساڑھے آٹھ بجے کے قریب اپارٹمنٹ پہنچے تو پاول پہلے سے ڈنر بنا کر ہمارا انتظار کر رہا تھا۔

ہم نے اکٹھے بیٹھ کر ڈنر کیا۔ ڈنر کے بعد کافی دیر تک گپ شپ کی۔ سوویت یونین اور روس کے نظام کے تفاوت پر بات چیت ہوئی۔ پاول روس کے موجودہ نظام کی تعریف کرتا رہا جبکہ میں سوویت یونین کے نظام کے فوائد گنواتا رہا۔ یہاں تک کہ ہم تھک ہار کر کچن ٹیبل سے اُٹھ کر اپنے اپنے بستروں میں دبک گئے۔

رُوس میں چوتھا دن

تین دن تک ماسکو میں گھومنے پھرنے اور آوارگی کرنے کے باوجود ابھی تک ایک انتہائی اہم فریضہ باقی تھا۔ دوبار کوشش کرنے کے باوجود ہم روس کے انقلاب کے بانی ولادی میر لینن کی زیارت نہیں کر پائے تھے۔ اتوار کے روز ہم کریملن کی بائیں طرف واقع اُن کے میوزیلیم گئے تھے تو وہاں لائن اتنی طویل تھی کہ اتنا عرصہ لائن میں لگنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ سوچا اگلے روز سوموار کا دن ہے لوگ کام پر ہوں گے۔ یہاں پر لوگوں کا جھمگٹا کچھ کم ہو گا۔ کریملن کے باقی ماندہ حصے اور اِرد گرد کے اہم مقامات دیکھنے آئیں گے تو لینن جی کی زیارت بھی کر لیں گے لیکن اگلے روز پتہ چلا کہ سوموار اور جمعہ کو لینن میوزیلیم بند ہوتا ہے۔
ہمارا پروگرام سوموار کی رات سینٹ پیٹرزبرگ کے لئے نکلنے کا تھا۔ اب سینٹ پیٹرزبرگ کی روانگی ایک دن موخر کرنی پڑی۔ کیونکہ امکان تھا کہ سینٹ پیٹرزبرگ میں ایک آدھ دن زیادہ رُک گئے تو پھر لینن کی زیارت نہیں ہو سکے گی۔ اس لئے پلان یہ بنا کہ صبح دس بجے سے پہلے لینن کے میوزیلیم پہنچ کر اُن کی زیارت کریں گے اور پھر اُس کے بعد سینٹ پیٹرزبرگ کے لئے نکل لیں گے۔
چونکہ لینن کے میوزیلیم میں کسی قسم کا کوئی بیگ یا کوئی اور سامان لے جانے کی اجازت نہیں اس لئے فیصلہ یہ ہوا کہ میں اور علی ٹرین سے کریملن کی طرف روانہ ہوں گے جب کہ پاول ہمارے بیگ لے کر گاڑی میں کریملن چلا آئے گا اور پھر ہمیں گاڑی میں بس اسٹینڈ پر چھوڑ دے گا جہاں ہم سینٹ پیٹرزبرگ کی بس پکڑیں گے۔

ہم چونکہ انڈر گراونڈ میٹرو سے کریملن آئے تھے اس لئے ہم نہ صرف جلد وہاں پہنچ گئے بلکہ جلد ہی ابدی نیند سوئے ہوئے لینن کے دیدار سے فارغ ہو گئے جب کہ پاول ابھی تک ماسکو کی ٹریفک میں پھنسا ہوا تھا۔

لینن کا میوزلیم کریملن کی بائیں دیوار کے ساتھ واقع ایک بہت ہی باوقار سیاہ رنگ کی یک منزلہ عمارت میں قائِم کیا گیا ہے۔

میوزلیم تک جانے کے لئے بائیں دیوار کے ساتھ ایک راہداری بنائی گئی ہے جس پر جانے کے لئے سیکورٹی گیٹ میں سے گزرنا پڑتا ہے جہاں چاک و چوبند وردی پوش گارڈ ہر زائر کو سیکورٹی گیٹ سے گزارتے اور اُس کی تلاشی لیتے ہیں۔ کسی کو میٹل کی بنی کوئی چیز میوزلیم میں لے جانے کی اجازت نہیں۔ یہاں تک کہ کیمرہ اور سیل فون لے جانا بھی منع ہے۔ میرے پاس سیل فون اور کیمرہ دونوں موجود تھے۔ میں نے سیل فون اور کیمرہ علی کو دیئے جو اُس نے اِس مقصد کے لئے بنائے گئے سیکورٹی ڈیپازٹ میں رکھ دیئے۔ میں تب تک راہداری پر چلتا میوزلیم تک جا پہنچا۔

راستے میں دائیں طرف کریملن کی دیوار کے ساتھ لینن کے ساتھ کام کرنے والے انقلابی لوگوں کے مجسمے بنائے گئے تھے۔ جبکہ راہداری کے ساتھ لینن سے لیکر چرنینکو تک سویت یونین میں بر سر اقتدار آنے والے لوگوں کے مجسمے رکھے گئے تھے۔

میرے میوزلیم تک پہنچنے تک علی بھی مجھ سے آن ملا۔ پھر میں اور علی میوزلیم میں داخل ہو گئے۔ میوزلیم کے اندر بھی تعمیر کے لئے سیاہ پتھر استعمال کئے گئے تھے۔ جن کی وجہ سے اندر مکمل تاریکی تھی۔ روشنی کے لئے زرد رنگ کی لائٹیں لگائی گئی تھیں۔ ہر کارنر پر ایک باوردِی گارڈ کھڑا تھا۔ میوزلیم کے عین سینٹر میں ایک کالے چمکدار پتھر کا اسٹیج بنا کر اس کے بیچ لینن کا جسدِ خاکی رکھا گیا تھا۔ سارا جسم سیاہ سوٹ میں

ملبوس تھا۔ صرف لینن کا چہرہ اور ہاتھ نظر آ رہے تھے۔ دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بند تھیں۔ دونوں ہاتھ پیٹ کے نچلے حصے پر رکھے تھے۔ ہاتھوں کی سفید زرد یلے رنگ کی پشت دکھائی دے رہی تھی۔ اسی طرح سفید زرد یلے رنگ کا چہرے پر مکمل اطمینان کی کیفیت تھی۔ آنکھیں بند تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے گہری نیند سو رہے ہوں۔ زائرین ایک طرف سے داخل ہو کر ایک راہداری میں چل کر سنٹر تک پہنچتے اور لینن کے گرد ایک مکمل چکر لگا کر دوسری راہداری سے باہر نکل جاتے۔ ہاتھوں اور چہرے پر دونوں طرف ہلکی ٹھنڈی سفید روشنی ڈالی گئی تھی تا کہ چہرہ اور ہاتھ صاف طور پر دیکھے جا سکیں۔

میں لینن کے جسدِ خاکی کے گرد چکر لگا رہا تھا تو میری نظریں اُن کے چہرے پر جمی تھیں۔ لیکن میرا ذہن روس میں ۱۹۰۶ سے ۱۹۲۱ کے واقعات کی تصویریں پلٹ رہا تھا۔ کچھ واقعات یہیں کریملن اور کریملن کے ارد گرد رونما ہو رہے تھے اور کچھ ماسکو سے باہر روس کے دوسرے شہروں اور قصبوں میں ریلوں کی شکل میں حالات کو مکمل انقلاب کی طرف بہائے چلے جا رہے تھے۔ ۱۹۰۶ کے انقلاب سے لے کر ۱۹۱۷ اور پھر ۱۹۱۷ سے ۱۹۲۱ تک لینن نے کس طرح انقلاب کی راہنمائی کی تھی یہ سب روسی انقلاب کی تاریخ کے وہ واقعات ہیں جن سے سیاسی جدوجہد کرنے والے ہمیشہ راہنمائی حاصل کرتے رہیں گے۔

ہم نے میوزیم سے نکل کر پاول کو کال کی تو وہ ابھی کریملن سے کافی دور تھا۔ میں اور علی نے فیصلہ کیا کہ ہم کریملن کے باہر بیٹھ کر پاول کا انتظار کرنے کی بجائے میٹرو کے اُس اسٹیشن تک چلے جاتے ہیں جس علاقے میں وہ ڈرائیو کر رہا ہے اور اُس سے کہتے ہیں کہ سنٹرل ماسکو آنے کی بجائے وہ وہیں ہمارا انتظار کرے تا کہ وقت بچایا جا سکے۔

پاول سے بات کر کے ہم دوبارہ میٹرو پر سوار ہو کر بس ٹرمینل پر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد پاول بھی ہمیں آن ملا۔ پاول کے آنے سے پہلے ہم نے سینٹ پیٹرزبرگ جانے والی بس کے اوقات چیک کئے تو ہمیں

پتہ چلا کہ بس شام سات بجے جائے گی لیکن اُس کے ٹکٹ پہلے ہی فروخت ہو چکے تھے۔ ہم مایوس ہو کر پاول کی گاڑی میں بیٹھ گئے اور مشورہ کیا کہ اب بہتر یہ ہو گا کہ ہم بس کی بجائے ٹرین پکڑیں۔ ابھی ہم گاڑی میں بیٹھے مشورہ کر رہے تھے کہ ہم نے دیکھا دو پولیس والے ایک آدمی کو پکڑ کر گھونسوں اور لاتوں سے پیٹ رہے تھے۔ پاول کی نظر اُن پر پڑی تو وہ گاڑی سے نکل کر پولیس والوں پر برس پڑا کہ وہ اُسے کیوں پیٹ رہے ہیں۔ اگر اس نے کوئی جرم کیا ہے تو وہ اُسے گرفتار کریں اور پیٹنا بند کر دیں۔ پاول کی پولیس والوں کو سرزنش دیکھ کر ہم کچھ پریشان ہوئے کہ یہ بلا خواہ مخواہ ہمارے گلے نہ پڑ جائے۔ لیکن پولیس والوں نے پاول کا احتجاج دیکھ کر اپنے شکار کو چھوڑ دیا اور بس اسٹینڈ پر اپنی جگہ پر جا کر کھڑے ہو گئے۔ ہم نے بھی اطمینان کا سانس لیا۔ پاول سے درخواست کی وہ فوراً وہاں سے ریلوے اسٹیشن چلے۔

ہمارے کہنے پر اُس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ہم ریلوے اسٹیشن روانہ ہو گئے۔ تب تک پاول بھی کچھ نرم پڑ چکا تھا۔ پاول کے احتجاج پر ہمیں خوشی بھی ہوئی اور تشویش بھی۔ روس میں آج کل لا اینڈ آرڈر کی صورتِ حال کچھ زیادہ اچھی نہیں۔ کمیونسٹ روس رفتہ رفتہ مر رہا ہے اور اُس کی جگہ ایک نیا روس اُبھر رہا ہے جو کہ سامراجی دنیا کا حصہ ہے۔ نئے روس میں ابھی چیزوں کی شکل و صورت بن رہی ہے۔ لا اینڈ آرڈر بھی ابھی صورت پذیر ہے۔ پولیس والے مادر پدر آزاد ہیں۔ وہ من مانی کرتے ہیں۔ انتظامیہ میں رشوت خوری عام ہے۔ سامراجی دنیا نے مل کر سوویت یونین کے خلاف سرد جنگ لڑی تھی۔ جس میں سوویت یونین کو شکست ہوئی۔ اب سامراجی دنیا اِس کا پھل سمیٹنے کی کوشش کر رہی ہے۔ چنانچہ تمام ملٹی نیشنل کمپنیاں روس میں داخل ہو چکی ہیں اور نئے روس کی لوٹ کھسوٹ میں اپنا اپنا حصہ ڈال رہی ہیں۔ کرپشن کی ترویج بھی نئے روس کی صورت گری کی ایک شکل ہے۔ ایسے میں پاول جیسے نوجوانوں کا ظلم کے

خلاف ردِّ عمل ایک مثبت سماجی عمل ہے۔ جس کے نتیجے میں رُوس ایک پُر امن ترقی یافتہ اور مہذب ملک کے طور پر اُبھر سکتا ہے۔ پاول نئے روس کا نمائندہ ہے۔

وہ کیمونسٹ دور کو ایک جیل اور موجودہ دور کو آزادیوں کا دور قرار دیتا ہے۔ میں جتنے دن پاول کے ساتھ رہا میں جہاں کہیں کوئی اچھی چیز دیکھتا کہتا یہ میڈ اِن سوویت یونین ہے وہ کہتا نہیں یہ روس نے بنائی ہے۔ وہ جہاں کہیں کوئی خستہ حال چیز دیکھتا کہتا یہ میڈ اِن سوویت یونین ہے۔

اب تک پروگرام یہی تھا کہ صرف میں اور علی سینٹ پیٹرز برگ جائیں گے۔ لیکن جب ہم ریلوے اسٹیشن پہنچے تو میں نے پاول سے کہا کیا ہی اچھا ہو اگر وہ بھی ہمارے ساتھ سینٹ پیٹرز برگ چلے۔

میرے کہنے پر وہ فوراً ہی تیار ہو گیا۔ کہنے لگا ٹھیک ہے وہ بھی ہمارے ساتھ سینٹ پیٹرز برگ جائے گا۔ مجھے اُس کے فیصلے سے بہت خوشی ہوئی۔ کیونکہ پاول بہت ہی زندہ دل اور خوبصورت آدمی ہے۔ اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں اتنی خوبصورت گفتگو کرتا ہے کہ طبعیت خوش ہو جاتی ہے۔

پاول کا پورا نام پاول ویتالیوچ ہے۔ پاول اپنے یہودی ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہے۔ لیکن وہ خالص سوویت معاشرے کی پیداوار ہے جس میں مذہب صرف علامتوں تک محدود تھا۔ لیکن پاول اُس سے بھی آزاد ہے۔ میں نے امریکہ اور اسرائیل میں نوجوان یہودی لڑکے لڑکیاں دیکھے ہیں۔ مذہب اور زندگی کے بارے میں اُن کا رویہ دیکھا ہے۔ مجھے پاول میں ایسی کوئی بات نظر نہ آئی۔ اُس کی گفتگو اور شب وروز میں مجھے یہودیت کا کوئی رنگ دکھائی نہ دیا۔ اُس کے ماں باپ ابھی زندہ ہیں لیکن اُس کا اپنے ماں باپ سے ملنا جلنا نہیں ہے۔ وہ نئے روس کی نئی نوجوان نسل کا نمائندہ ہے۔

اُس کی ایک کزن جس کا نام کیتھرینا ہے سینٹ پیٹرز برگ میں رہتی ہے۔ کتھرینا نے کئی سال قبل شادی کی تھی جس میں سے اُس کے دو بچے ہیں۔ ایک بیٹا ایک بیٹی۔ وہ شادی کر کے اپنے خاوند کے ساتھ پراگ چلی گئی تھی۔ وہیں اُس نے دو بچوں کو جنم دیا تھا۔

اِس کے بعد اُس کا خاوند اُسے چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ پراگ چھوڑ کر بچوں کے ساتھ سینٹ پیٹرز برگ چلی آئی۔ پاول کے پاس اُس کا کچھ سامان تھا۔ پہلے ہم نے وہ سامان ساتھ لے جا کر کتھرینا کو دینا تھا۔ لیکن اب وہ خود ہمارے ساتھ سینٹ پیٹرز برگ جانے پر آمادہ تھا۔

صرف یہی نہیں کہ پاول روسی تھا اور اُس کی وجہ سے ہمیں ہر قدم پر فوائد حاصل ہو رہے تھے اُس کا مسکراتا چہرا اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں مسلسل جملے بازی دیارِ غیر میں ہمارے لئے سامانِ نشاط تھی۔ جن کاموں پر ثقافتی، لسانی اور ماحولیاتی اجنبیت کی وجہ سے گھنٹوں لگ سکتے تھے وہ پاول کی وجہ سے منٹوں میں ہو رہے تھے۔ ہم کم وقت میں روس کا زیادہ سے زیادہ حصہ اپنے شعور میں اُتارتے چلے جا رہے تھے۔

ہم گاڑی کھڑی کر کے ریلوے اسٹیشن کے اندر گئے اور جا کر ریل کا پتہ کیا تو پتہ چلا کہ اب ریل رات کے گیارہ بجے روانہ ہو گی جو صبح سات بجے سینٹ پیٹرز برگ پہنچے گی۔ ہم نے اللہ کا نام لے کر اُسی ٹرین سے سیٹیں بک کرائیں اور ریلوے اسٹیشن سے باہر آ گئے۔

اُس وقت دن کے تین بجے تھے۔ سوچا اب گیارہ بجے تک ماسکو میں کوئی اور یادگار جگہ دیکھی جائے۔

سنٹرل اسٹیشن سے ایک گھنٹے کی ڈرائیو کے فاصلے پر کیتھرین دی گریٹ کا محل تھا جسے ایک خوبصورت پارک میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ پارک کا نام ہے ساری استنوسنا۔ اس محل کو دیکھنے کے علاوہ پارک میں انجوائے کرنے کے لئے اتنی خوبصورت جگہیں ہیں کہ انسان گھنٹوں وہاں گھومے پھرے اور بور نہ ہو۔ ہمارے اتفاق کے بعد پاول نے گاڑی ساری استنوسنا پارک جانے والے راستے پر ڈال دی۔ ماسکو کی سڑکو

ل پر ابھی تک کافی رش تھا اس لئے گاڑی سست رفتار کے ساتھ پارک کی طرف رواں رہی۔ راستے میں پاول ہمیں مختلف بلڈنگوں کے بارے میں بتاتا رہا کہ کونسی بلڈنگ کیا ہے اور وہ کب تعمیر ہوئی تھی۔ ماسکو کی زیادہ تر عمارات سٹالن کے دور میں تعمیر ہوئیں تھیں اور ان میں اسی دور کا فن تعمیر نمایاں تھا۔

جب بھی پاول بتاتا کہ یہ فلاں عمارت ہے اور یہ اسٹالن یا خروشچیف کے دور میں تعمیر ہوئی تھی تو میں کہتا دیکھو سارے اچھے کام سوویت یونین میں ہوئے تھے۔ کبھی کبھار میرے کلمات پر اس کا چہرہ اتر جاتا اور اس پر یاسیت کے اثرات دکھائی دیتے لیکن وہ پھر بعد از سوویت یونین رونما ہونے والی تبدیلیوں کا ذکر شروع کر دیتا۔

وہ بڑے فخر سے کہتا سڑکوں پر یہ سب دوڑتی گاڑیاں دیکھ رہے ہو۔ مرسڈیز، بی ایم ڈبلیوز، آیوڈیز، ٹیوٹاز یہ سب سوویت یونین کے بعد آئی ہیں ورنہ یہاں صرف بدصورت سوویت کاریں دکھائی دیتی تھیں جن کا کوئی نیا ماڈل نہیں آتا تھا۔ یہ میکڈانلڈ، یہ سب ویز، یہ کنٹکی فرائیڈ چکن کچھ بھی نہیں تھا۔ میں جواب دیتا پاول جانتے ہو جب ایک روسی میکڈانلڈ پر چند سو روبلز میں برگر خریدتا ہے وہ سب روبلز فوراً اس کی جیب سے نکل کر امریکہ کی جیب میں پہنچ جاتے ہیں۔ جب ایک روسی ایک جرمن یا جاپانی یا امریکی گاڑی قسطوں پر خریدتا ہے تو ہر ماہ اس کی جیب سے نکلنے والے روبلز پھر جرمن، جاپان اور امریکہ کی جیب میں پہنچ جاتے ہیں۔ میرا جواب سن کر پاول کا چہرہ پھر اتر جاتا۔ لگتا اسے سادہ سی بات کی سمجھ آ گئی ہے کہ سامراجی قوتوں نے اگر سرد جنگ لڑی تھی اور ان سب کارپوریشنوں نے اس جنگ کی حمایت کی تھی تو کیوں کی تھی اور اب انہیں اس نفع کیوں اور کس طرح حاصل ہو رہا ہے۔

ایسی باتیں کرتے ہم مین روڈ سے اتر کر پارک والی سڑک پر ہوتے ہوئے پارک پہنچے تو سامنے کیتھرین گریٹ کا محل اپنی تمام تر وجاہت اور شان و شوکت کے ساتھ کھڑا تھا۔ پاول نے گاڑی پارکنگ لاٹ میں

پارک کی اور ہم آہستہ آہستہ چلتے محل کے سامنے جا پہنچے۔ محل مخصوص روسی انداز میں تعمیر کیا گیا تھا۔ جس کے ارد گرد وسیع و عریض فطرتی منظر حد نظر تک پھیلا تھا۔ محل کے ساتھ ایک جھیل تھی۔ جھیل اور محل کے درمیان ایک چھوٹا سا پاولین بنایا گیا تھا جس پر روسی میں لکھا تھا یہ پاولین ہلکے پھلکے خوبصورت لمحات کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ ہم کافی دیر کتھرین دی گریٹ کے محل سے ملحقہ پارک اور جھیل کے مناظر سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ جھیل میں ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا جس تک جانے کے لئے پل بنایا گیا تھا۔ اکثر و بیشتر محبت کرنے والے جوڑے اس جزیرے پر خلوت کے لمحات گزارتے تھے۔ جزیرے پر بہت سے فواروں کے اچھلتے پانی سے رقص کا ایک خوبصورت منظر تخلیق کیا گیا تھا جس کے ساتھ انتہائی خوبصورت میوزک سارے پارک اور جھیل کے منظر کو انتہائی دلکش بنا رہا تھا۔ جی چاہتا تھا جزیرے پر فواروں کا اچھلتا پانی اسی طرح رقص کرتا رہے۔ میوزک یونہی چلتا رہے اور ہم وہیں بیٹھے رہیں۔ ہم نے وہاں ایک آئس کریم والی سے ایک ایک آئس کریم خریدی اور جھیل کے کنارے بیٹھ کر کھائی۔

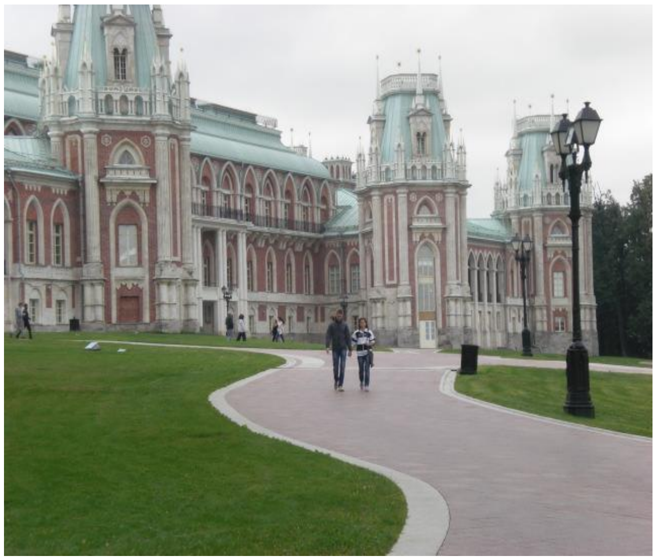

ماسکو میں کتھرینا دی گریٹ کا پیلس

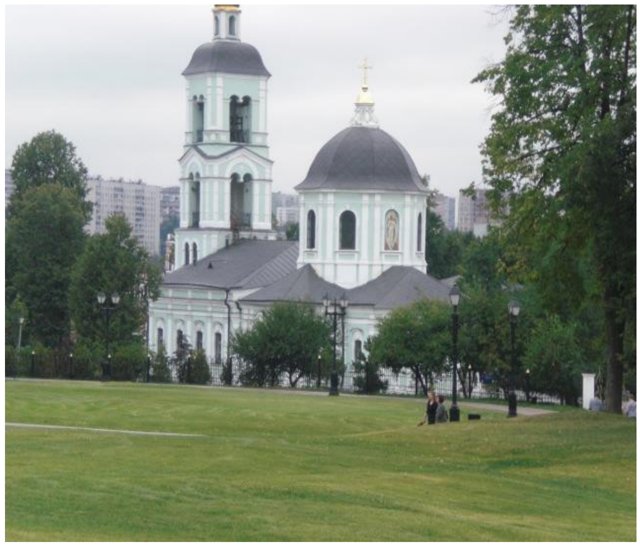

کتھرینا دی گریٹ کا اپنے پیلس کے دائیں ہاتھ بنایا گیا

پرائیوٹ پاویلین

کتھرین کے محل کے مناظر سے لطف اندوز ہونے کے بعد ہم نے اپارٹمنٹ واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ آج رات ہمیں گیارہ بجے کی ٹرین سے سینٹ پیٹرز برگ کے لئے نکلنا تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ اپارٹمنٹ پہنچ کر ڈنر کیا جائے اور کچھ دیر آرام کرنے کے بعد رات کی ٹرین پکڑی جائے۔

آج منگل کی رات تھی۔ رات بھر سفر کر کے ہمیں بدھ کی صبح سینٹ پیٹرز برگ پہنچنا تھا۔ سارا دن سینٹ پیٹرز برگ دیکھ کر رات کو واپس ماسکو کے لئے بذریعہ ٹرین روانہ ہونا تھا۔ اس طرح ہمیں جمعرات کے دن علی الصبح واپس ماسکو پہنچنا تھا۔

چنانچہ پروگرام کے مطابق ہم کتھرین کے محل کی سیاحت سے فارغ ہو کر سات بجے کے قریب واپس اپارٹمنٹ پہنچے۔ علی اور پاول نے مل کر دس پندرہ منٹ میں ڈنر تیار کیا۔ ڈنر کھا کر ہم سرِ شام بستروں میں دبک گئے۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ آرام کیا اور پھر نہا دھو کر میٹرو اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئے۔ اُس میٹرو اسٹیشن سے سینٹ پیٹرز برگ کے لئے روانہ ہونے والی ٹرین کے اسٹیشن کا کوئی تیس منٹ کا فاصلہ تھا۔

میٹرو سے ہم ماسکو کے مین ریلوے اسٹیشن پہنچے تو سینٹ پیٹرز برگ کی ٹرین تقریباً تیار تھی۔ ہمارے پاس پاول کی کزن کتھرینا کے چند کپڑوں کے ایک شاپر بیگ کے سوا کوئی سامان نہیں تھا۔ اس لئے بغیر کسی دشواری کے ایک ٹرین سے اتر کر دوسری میں سوار ہو گئے۔

ٹرین میں کوپے بنے تھے۔ ہر کوپے میں چار مسافروں کے بیٹھنے اور سونے کی جگہ تھی۔ صاف ستھرے بستر بچھے تھے۔ ہمارے بیٹھتے ہی تھوڑی دیر بعد ٹرین سینٹ پیٹرز برگ کے لئے روانہ ہو گئی۔

پاول نے کہا چونکہ چوتھا مسافر نہیں آیا اور اب اِس ٹرین کو سینٹ پیٹرز برگ تک کہیں رکنا نہیں اِس لئے اِس کوپے میں ہم صرف تین ہی ہوں گے۔ کوپے کا آرام دہ ماحول دیکھ کر میں نے پاول سے پھر

چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ میرا کہنا تھا مسافروں کے لئے اتنی آرام دہ ٹرین صرف سوویت یونیں ہی بنا سکتا تھا۔ پاول بھی خوشگوار موڈ میں تھا۔ کہنے لگا نہیں سوویت یونین نہیں یہ ٹرین روس نے بنائی ہے۔ واپسی پر ہم کوشش کریں گے کہ سوویت یونین کی بنائی ہوئی ٹرین پر سفر کریں۔ تھوڑی دیر ہم ایسے ہی مختلف حوالوں سے گفتگو کرتے رہے۔ پھر لائٹس آف کر کے اپنی اپنی برتھ پر لیٹ گئے۔ ٹرین کا ٹریک خاصہ ہموار تھا۔ اس لئے ٹرین بغیر شور چل رہی تھی۔ ہم تینوں جلد ہی سو گئے۔

صبح چھ بجے کے قریب ٹرین جب سینٹ پیٹرز برگ کے قرب وجوار میں پہنچی تو ایک خوشگوار الارم نے ہمیں بیدار کیا۔ ہم نے یکے بعد دیگرے باتھ روم میں جا کر چہروں پر پانی کے چھینٹے مارے، بال درست کئے، اور اپنے اپنے آپ کو تازہ کر کے سیٹوں پر بیٹھ کر کھڑکیوں سے سینٹ پیٹرز برگ کے نواح کے مناظر سے لطف اندوز ہونے لگے۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد ٹرین سینٹ پیٹرز برگ کے ریلوے اسٹیشن پر جا کر رک گئی۔

رُوس میں پانچواں دن

سینٹ پیٹرز برگ

ہم گاڑی سے اُترے تو پاول کی کزن کتھرین ریلوے اسٹیشن پر ہماری منتظر تھی۔ لگتا تھا کہ وہ گھر سے کام پر جانے کے لئے تیار ہو کر آئی ہے۔ اُس نے خندہ پیشانی سے ہم تینوں کو سینٹ پیٹرز برگ میں خوش آمدید کہا۔ ہم تینوں آہستہ آہستہ چلتے پلیٹ فارم سے باہر آئے اور اسٹیشن کے خوبصورت لاؤنج سے ہوتے ہوئے باہر نکل آئے۔

باہر پانی والے ٹرک سینٹ پیٹرز برگ کی سڑکیں دھو رہے تھے۔ یہی چیز میں نے ماسکو میں بھی دیکھی تھی۔ اسی وجہ سے ماسکو اور سینٹ پیٹرز برگ کی سڑکیں انتہائی صاف ستھری تھیں۔ کہیں کوئی گرد و غبار یا گند دکھائی نہیں دیتا تھا۔ پاول نے مجھے بتایا کہ پانی کے ٹرک ہمیشہ اسی طرح ماسکو اور سینٹ پیٹرز برگ کی سڑکیں صاف رکھتے ہیں۔

ریلوے اسٹیشن کے باہر کتھرین ہمیں خدا حافظ کہہ کر رخصت ہونے لگی تو میں نے اس سے کہا کہ اُس کا بھائی پاول بہت اچھا انسان ہے اور اُسے اُس کی بہن ہونے پر فخر ہونا چاہئے۔ وہ میری بات سن کر پاول سے بغلگیر ہوئی اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور پھر کہنے لگی کہ اُس کا بھائی واقعی بہت اچھا ہے اور اُسے اُس پر بہت فخر ہے۔ یہ کہہ کر اُس نے ہمیں خدا حافظ کہا اور پاول سے شاپر بیگ لے کر چلی گئی۔ ہم تھوڑی دیر مخالف سمت میں پیدل چلتے اگلی سڑک پر بائیں جانب مڑ گئے۔ یہ سڑک سیدھی دریائے نیوا کے کنارے جاتی تھی جہاں سے زارِ روس پیٹر کے جزیرے پر واقع محل کے لئے جہاز چلتے تھے۔

ہم اُسی سڑک پر مختلف عمارات کے تعمیر اتی حسن سے لطف اندوز ہوتے دریائے نیوا کی جانب گامزن رہے۔ راستے میں ہمیں ایک جگہ میکڈانلڈ دکھائی دیا تو ہم ناشتہ کرنے کے لئے وہاں رک گئے۔

سینٹ پیٹرزبرگ ماسکو کے بعد دوسرا اہم ترین شہر ہے۔ بلکہ کئی حوالوں سے سینٹ پیٹرزبرگ کو ماسکو پر بھی فوقیت حاصل ہے۔ خاص طور پر سینٹ پیٹرزبرگ کی عمارات فنِ تعمیر کے بہترین نمونے ہیں۔ کسی سڑک پر کسی سمت چلتے جائیں ہر عمارت کا حسن آپ کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتا اور آپ کو دعوتِ نظارہ دیتا ہے۔

سینٹ پیٹرزبرگ کی اہمیت صرف اِس کی عمارات کے حسن تک محدود نہیں بلکہ اِس کے چپے چپے پر روس کی تاریخ کے کئی اہم باب رقم ہیں۔ سینٹ پیٹرزبرگ والوں نے تاریخ کو محفوظ کرنے کے لئے اہم جگہوں پر ایسے تاریخی واقعات کی تختیاں نصب کرر کھی ہیں اور اہم شخصیات کے مجسمے کھڑے کئے ہوئے ہیں۔ مجسموں پر اُن شخصیات کے ناموں کے علاوہ روسی زبان میں اُن کے کارناموں کے حوالے بھی موجود ہیں۔

ایسے ہی مجسموں میں سے ہم نے سر راہ اُن دو جرنیلوں کے مجسمے بھی دیکھے جنہوں نے نپولین بوناپارٹ کے خلاف جنگ میں دادِ شجاعت دی تھی۔ ایک مجسمہ ہم نے ایک فرانسیسی جرنیل کا دیکھا جو اپنی فوج کو چھوڑ کر روسیوں کے ساتھ مل گیا تھا۔

1703 میں اپنی بنیاد رکھے جانے سے لیکر دور حاضر تک سینٹ پیٹرزبرگ اپنی خوبصورتی کی وجہ سے ارد گرد کی ریاستوں کی ہوسِ ملک گیری کا نشانہ بنتا رہا ہے لیکن سینٹ پیٹرزبرگ کے شہریوں نے ہمیشہ بیرونی قوتوں کو ایسی جارحیتوں میں شکست دے کر اپنی آزادی کو برقرار رکھا۔

تاریخی ریکارڈ کے مطابق جب پیٹر اول نے 1703 میں سینٹ پیٹرز برگ بنانے کا فیصلہ کیا تو اس مقام پر دلدلوں کی وجہ سے اس کی بنیاد رکھتے ہوئے ہزاروں انسان لقمہء اجل بنے۔ اِس کے بعد اِس کی تین سو سالہ تاریخ میں تقریباً ہر سو سال بعد سینٹ پیٹرز برگ پر کوئی نہ کوئی آفت ٹوٹی لیکن یہ شہر اپنی جگہ پوری شان و شوکت کے ساتھ کھڑا رہا۔

دوسری جنگ عظیم میں ہٹلر کی فوجوں نے سینٹ پیٹرز برگ کا تقریباً ڈھائی سال تک محاصرہ جاری رکھا لیکن آخر کار ذلیل و رسوا ہو کر اُسے یہ محاصرہ ختم کرنا پڑا۔

یورپ سے آنے والے ہر سیاح کو سینٹ پیٹرز برگ میں کسی نہ کسی شہر کی کوئی نہ کوئی مشابہت دکھائی دیتی ہے۔ کسی کو سینٹ پیٹرز برگ کی عمارتوں میں پیرس کی عمارتوں سے مشابہتیں دکھائی دیتی ہیں اور کسی کو اِس میں بہنے والی بے شمار نہریں دیکھ کر ایمسٹرڈیم یاد آتا ہے۔ کسی کو اِس میں لاتعداد پُل اور سمندر اور دریائے نیوا کے مناظر دیکھ کر وینس یاد آتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مصنف کو اِن تینوں شہروں کی سیاحت کا موقع ملا ہے جو حسن سینٹ پیٹرز برگ میں ہے وہ نہ پیرس میں ہے، نہ ایمسٹرڈیم میں اور نہ وینس میں۔ سینٹ پیٹرز برگ اپنی مثال آپ ہے اور اِس جیسا کوئی اور شہر دنیا میں موجود نہیں۔

سینٹ پیٹرز برگ کی ایک عمارت

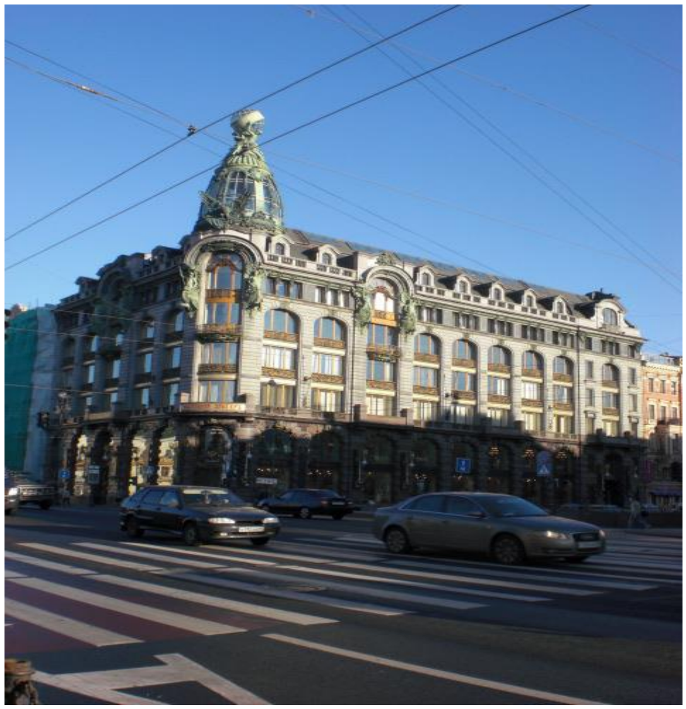

سینٹ پیٹرز برگ میں ایک اور عمارت

سینٹ پیٹرز برگ میں ایک اور عمارت

سینٹ پیٹرز برگ ایک اور عمارت

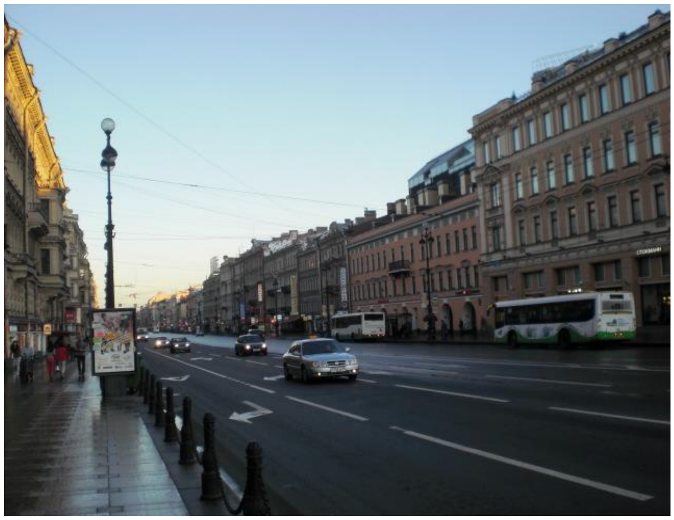

سینٹ پیٹرزبرگ کی ایک روڈ کا منظر

سینٹ پیٹرز برگ میں ایک اور عمارت

سینٹ پیٹرز برگ کی لائبریری جہاں لینن نے
دو سال تک ریسرچ کی

سینٹ پیٹرز برگ کی اسی سڑک پر چلتے ہمیں ایک جگہ ایک لائبریری کی عمارت دکھائی دی۔ عمارت پر ایک تختی لگی تھی۔ تختی پر لینن کی تصویر بنی تھی اور نیچے لکھا تھا کہ لینن انقلاب سے پہلے دو سال تک اس لائبریری میں ریسرچ کے لئے آیا کرتے تھے۔

اِس سے پہلے ایسی ہی کچھ تختیاں ہم ماسکو میں مختلف عمارات پر دیکھ چکے تھے جہاں انقلابِ روس کے بانی ولادمیر لینن مختلف سرگرمیوں کے لایا آیا کرتے تھے۔ ہر تختی پر لینن کی تصویر، تاریخ اور مختصر مقصد درج تھا کہ اِس جگہ لینن نے فلاں اعلان کیا تھا یا فلاں مقصد کے لئے ایک بار تشریف لائے تھے یا اتنا عرصہ یہ جگہ اِس مقصد کے لئے اُن کے زیرِ استعمال رہی۔

سینٹ پیٹرز برگ کے ریلوے اسٹیشن سے نکل کر ہم کوئی گھنٹہ بھر پیدل چلنے کے بعد دریائے نیوا کی اُس گھاٹ پر پہنچے جہاں سے جہاز پیٹر اول کے جزیرے تک جاتے تھے۔

اُس وقت مختلف ملکوں سے آئے بہت سے سیاح وہاں موجود تھے جنہیں چھوٹے جہاز بھر بھر کر پیٹر اول کے جزیرے پر لے جا رہے تھے۔ ہم بھی ٹکٹ خرید کر ایک جہاز پر سوار ہو گئے۔ کوئی بیس پچیس منٹ تک جہاز دریائے نیوا میں چلنے کے بعد سمندری حدود میں داخل ہوا۔ بیس پچیس منٹ سمندر میں چلنے کے بعد پیٹر کے جزیرے پر جہاز لنگر انداز ہوا تو سارے مسافر جہاز سے اُتر کر اس مقصد کے لئے بنائی گئی جٹی پر چلتے جزیرے تک پہنچے۔

وہاں ایک نہر پیٹر کے محل کے نیچے سے آ کر سمندر میں گر رہی تھی۔ اِس نہر کے دونوں طرف چلنے کے لئے سڑک بنائی گئی تھی جس پر گاڑیوں کا داخلہ منع تھا۔ وہاں صرف پیدل چلا جا سکتا تھا۔

کہتے ہیں کہ یہ نہر کئی میل دور سے لائی گئی ہے جس کا مقصد محل کے سامنے اور ارد گرد کے فواروں کو میکانکی قوت سے چلانے کی بجائے زمین کی کشش کو استعمال کر کے چلانا ہے۔ محل کی تعمیر سے اب تک نہر کے اس کے پانی سے بخوبی سرانجام پا رہا ہے۔

یوں تو سارے جزیرے کو سیاحوں کے لئے ایک خوبصورت اسپاٹ بنا دیا گیا ہے لیکن سیاحوں کی توجہ کا مرکز پیٹر کا محل اور اُس کے سامنے چلنے والے سنہری فوارے ہیں۔

فواروں کو دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ یہ سونے سے بنائے گئے ہیں۔ کئی لوگ اِن کی چمک دیکھ کر اِن کو چیک کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ آیا اِنہیں واقعی سونے سے بنایا گیا ہے۔ ایسے میں کوئی پاس کھڑا اسکیورٹی گارڈ اُنہیں بتا دیتا ہے کہ یہ سونے کے نہیں بلکہ محض اِن پر سنہری پلیٹیں چڑھائی گی ہیں۔ جن کو باثوق ذرائع سے یہ انفارمیشن نہیں ملتی اُن کا گمان قائم رہتا ہے کہ یہ فوارے سونے کے بنے ہیں۔

پیٹر کا محل اور جزیرہ ہفتے میں ساتوں دن سیاحوں کے لئے دن کے دس بجے کھولا جاتا ہے۔ جب دس بجے محل کھلتا ہے اُسی وقت فوارے آن کئے جاتے ہیں۔ محل کھولتے اور فوارے آن کرتے وقت زبردست میوزک بجایا جاتا ہے۔ فواروں کے پانی کی اُچھل کود اور موسیقی مل کر ایک عجیب سماں پیدا کرتے ہیں۔ سارے سیاح پانی اور موسیقی کے اِس شو کے سحر سے مسحور اپنی اپنی جگہ اُس وقت تک ساکت رہتے ہیں جب تک یہ شو چلتا ہے۔ پیٹر کے جزیرے پر صرف بین الاقوامی سیاح ہی نہیں آتے خود روسیوں کی بہت بڑی تعداد وہاں موجود ہوتی ہے جو اپنی فیملی کے ساتھ پیٹر کے محل اور جزیرے کی سیاحت کے لئے آتے ہیں۔

سینٹ پیٹرز برگ میں زار روس پیٹر دی گریٹ کا محل

زارِ رُوس پیٹر کے محل کے سامنے لگے فوارے
اور محل کے نیچے سے بہتی نہر جو سمندر میں جا گرتی ہے

ہم کوئی ساڑھے بارہ بجے کے قریب جزیرے پر پہنچے تھے۔ جزیرے پر اِدھر اُدھر گھومتے پھرتے ہم کوئی ڈیڑھ بجے کے قریب پیٹر کے محل پہنچے۔ وہاں کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ہم محل کے گردونواح کے ماحول سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ سینٹ پیٹرز برگ کا یہ مین مقامِ سیاحت دیکھنے کے بعد ہم نے جزیرے سے سینٹ پیٹرزبرگ واپس جانے کا فیصلہ کیا۔

دریائے نیوا کے کنارے جہاں ہم نے جزیرے پر آنے کے لئے جہاز لیا تھا وہاں سامنے سینٹ پیٹرز برگ کا مشہور زمانہ ہرمتاج آرٹ میوزیم واقع ہے۔ پہلے ہم جزیرے پر آنے سے پہلے آرٹ میوزیم کی سیاحت کرنا چاہتے تھے۔ پھر فیصلہ ہوا کہ پہلے جزیرے پر جائیں گے۔ پیٹر کا محل دیکھیں گے۔ واپسی پر آرٹ میوزیم کے اندر جائیں گے اور روسی فن کاروں کے بنائے ہوئے فن پاروں کی جمالیات سے لطف اندوز ہوں گے۔

پیٹر کے محل سے نہر کے کنارے چلتے ہم واپسی جہاز پکڑنے کے لئے جیٹی پہنچے تو دن کے تین بج رہے تھے۔ سب کا بھوک سے بُرا حال ہو رہا تھا۔ وہاں ایک فاسٹ فوڈ ریسٹورانٹ دکھائی پڑا جہاں برگر وغیرہ بک رہے تھا۔ سوچا وہاں بیٹھ کر لنچ کرتے ہیں۔ ریسٹورانٹ پر فوڈ کی بنی تصویریں بہت عمدہ تھیں۔ بدقسمتی سے جب ہم نے فوڈ خریدی تو وہ اتنی اچھی نہیں تھی۔ بھوک کی وجہ سے ہم سب نے وہاں برگر کھائے لیکن اُن کی کوالٹی اور ذائقے سے کوئی خوش نہیں تھا۔

خیر لنچ کرکے ہم لوگ جیٹی پر آکر واپسی کے جہاز پر بیٹھے تو سب کی آنکھ لگ گئی۔ سمندر میں چلتا جہاز دوبارہ دریائے نیوا کے پانیوں میں ہوتا ہوا آرٹ میوزیم کے سامنے آکر رکا تو ہماری آنکھ کھلی۔

جہاز پر آدھ گھنٹہ تک ستانے سے دن بھر پیدل چلنے کی تھکن سے قدرے راحت ملی لیکن میرا جسم اب پیدل چلنے سے انکاری تھا۔ ایک ایک قدم سو سو من کا ہو رہا تھا۔

علی اور پاول نے میری ہمت بندھائی لیکن کہاں صبح کی سفیدی اور کہاں شام کے دھندلکے۔ میں نے کہا اب میوزیم کے اندر جانے کی ہمت نہیں ہے۔ اسٹیشن تک پیدل چل کر واپس جانا بھی مشکل ہے۔ بہتر ہو گا ہم ٹیکسی لیں اور اسٹیشن واپس چلیں۔

میوزیم کے اندر جانے کو جی بہت للچا تا تھا لیکن جس میوزیم میں تین ملین آرٹ کے نمونے رکھیں ہوں وہاں ایک آدھ گھنٹے میں کیا دیکھا جا سکتا تھا۔ چنانچہ ہم نے میوزیم کے اندر جانے کا ارادہ ترک کیا اور ٹیکسی پکڑ کر اسٹیشن چلے آئے۔ سینٹ پیٹرزبرگ کی سڑکوں پر ٹیکسی تقریبا 45 منٹ چل کر ریلوے اسٹیشن واپس پہنچی۔ ٹیکسی کی رفتار اور وقت دیکھ کر کچھ اندازہ ہوا کہ ہم صبح اسٹیشن سے نکل کر کتنا پیدل چلے تھے۔

اسٹیشن پہنچ کر ماسکو واپس جانے والی گاڑی کا پتہ کیا تو پتہ چلا کہ اب گاڑی رات 9 بجے ماسکو کے لئے روانہ ہو گی۔

جس گاڑی سے ہم آئے تھے یہ اُس سے کچھ کمتر درجے کی تھی۔ اِس لئے اِس کا کرایہ بھی کوئی پچیس ڈالر کم تھا۔ دوسری والی گاڑی رات گیارہ بجے روانہ ہونا تھی۔ ہم نے سوچا بجائے اِس کے کہ اسٹیشن پر دوسری گاڑی کا انتظار کریں بہتر ہو گا تھوڑے کم درجے والی گاڑی کے سفر کے مزے لئے جائیں۔ چنانچہ ہم نے اُس گاڑی کے ٹکٹ خریدے اور اسٹیشن پر ہی بنے ایک کیفے میں جا کر چائے پینے بیٹھ گئے۔

چائے کے لفظ سے یاد آیا کہ اب یہ لفظ بین الاقوامی لفظ بن چکا ہے۔ مشرق و مغرب میں جہاں جائیں لوگ چائے کو چائے ہی کہتے ہیں۔ خیر چائے پی کر فارغ ہوئے تو پاول کا خیال تھا کہ ہم ٹور بس کے ذریعے

سینٹ پیٹرز برگ کا ٹور لیں۔ ہم ریلوے اسٹیشن پر واقع ٹور آفس پہنچے تو وہاں سے پتہ چلا کہ بسیں ڈھائی گھنٹے کا شہر کا ٹور دیتی ہیں۔ لیکن جب ٹور کے راستے اور سیاحوں کی دلچسپی کے مقامات کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ ہم پیدل سب جگہیں دیکھ آئے تھے۔ اب کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جو ہم نے نہ دیکھی ہو۔ اس لئے ٹور کا ارادہ کینسل ہوا۔ اِس وقت تک شام کے تقریباً ساڑھے پانچ یا چھ بج چکے تھے۔ ہم نے سوچا کسی ریستوران میں چلتے ہیں۔ وہاں بیٹھ کر تھوڑی دیر گپ شپ کریں گے۔ پھر شام کا کھانا کھائیں گے۔ تب تک ٹرین چھوٹنے کا وقت ہو جائے تو واپس آکر ٹرین پر سوار ہو کر ماسکو کی راہ لیں گے۔

پاول نے پوچھا ہم کس قسم کا ڈنر پسند کریں گے۔ مجھے گرچکا کافی سوٹ کر رہا تھا۔ اس لئے میں نے فوراً گرچکا کھانے کا عندیہ دیا۔ پاول تھوڑی دیر ہمیں وہیں چھوڑ کر باہر گیا۔ اسٹیشن کے باہر اُس نے چاروں طرف نظر دوڑائی اور ایک ریستوران کا انتخاب کر کے ہمیں لینے چلا آیا۔

ریستوران ریلوے اسٹیشن کے بالکل سامنے سڑک پار کوئی آدھ فرلانگ کے فاصلے پر واقع تھا۔ وہاں تک پہنچنے کے لئے کم از کم تین سڑکیں کراس کرنا پڑتی تھیں۔

ہم آہستہ آہستہ چلتے ریستوران پہنچے تو یہ ریستوران ریستورانوں کی ایک چین کا حصہ تھا۔ ماسکو میں بھی ہم نے ان کے ایک ریستوران پر ایک شام ڈنر کیا تھا۔ ان کی خوراک اچھی اور قیمتیں انتہائی مناسب تھیں۔ تین ساڑھے تین سو روبل میں وافر خوراک مل جاتی تھی۔

ہم نے ٹرے پکڑ کر اپنی اپنی پسند کی خوراک لی اور کاؤنٹر پر پیسے ادا کر کے ایک ٹیبل پر جا کر بیٹھ گئے۔ پاول کی بیوی کوئی دو سال قبل اُسے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ وہ اُسے بہت مِس کرتا تھا۔ پاول کو چھوڑنے کے بعد اُس نے کوئی اچھی ملازمت اختیار کر لی تھی اور اب اچھے پیسے بنا رہی تھی۔

ہم ریستوران میں ٹیبل پر بیٹھے تو وہاں ایک لڑکی دیکھ کر اُسے اپنی بیوی یاد آئی۔ میں نے اُس کا دل لبھانے کے لئے اُسے کہا کہ مجھے بھی زندگی کی اپنی پہلی محبت یاد آ رہی ہے۔ پھر میں نے اُسے کہا پاول جانتے ہو میں یو ایس واپس جانے کے بعد پہلا کام کیا کروں گا؟ اُس نے کہا نہیں۔ وہ نہیں جانتا کہ میں یو ایس اے جا کر پہلا کام کیا کروں گا۔

میں نے کہا پاول میں اپنی پہلی محبت کو کال کروں گا اور اُسے بتاؤں گا کہ میں کتنا بیوقوف تھا کہ میں نے تب اُس کی قدر نہ کی۔ میں اُسے یہ بھی بتاؤں گا کہ اب میں اُسے کتنا مِس کرتا ہوں اور اُس کے بغیر زندگی کتنی کٹھن ہے۔

وہ میری بات سن کر ہنسا۔ کہنے لگا لیکن میں اب اپنی بیوی کو کال نہیں کروں گا۔ کال کروں بھی تو اب وہ واپس نہیں آئے گی۔ میں اب کسی اور مناسب لڑکی کی تلاش میں ہوں۔ کئی لڑکیوں کے ساتھ وقت گزار چکا ہوں لیکن ابھی تک مجھے کوئی ڈھب کی لڑکی ملی نہیں ہے۔ جب ملے گی تو دوبارہ شادی کروں گا۔

روس میں بڑی فیملیوں کا رواج نہیں ہے۔ عام طور پر ایک روسی فیملی میں ایک یا دو بچے ہوتے ہیں۔ اُس کی وجہ روسیوں کا لائف اسٹائل ہے۔ زیادہ تر روسی اپارٹمنٹوں میں رہتے ہیں۔ اپارٹمنٹ زیادہ کشادہ نہیں ہوتے۔ اُن میں ایک چھوٹی فیملی ہی رہ سکتی ہے۔

انقلاب کے بعد لوگوں کو رہائیش فراہم کرنے کے لئے انقلابی حکومت نے بڑے پیمانے پر اپارٹمنٹ کمپلیکسوں کی تعمیر کی۔ خاص طور پر خرشچیف کے زمانے میں ماسکو اور ماسکو کے ارد گرد بہت زیادہ اپارٹمنٹ تعمیر کئے گئے۔ سوویت یونین کے زمانے میں یہ اپارٹمنٹ لوگوں کو رہنے کے لئے مفت دیئے جاتے تھے لیکن اب فروخت کئے جاتے ہیں۔

پاول بھی اپنے اپارٹمنٹ کا مالک ہے۔ اب وہ اس کوشش میں ہے کہ کوئی مناسب لڑکی ملے تو اُس سے شادی کر کے گھر بسائے اور اولاد پیدا کرے۔

ہم تقریباً آٹھ بجے تک ریستوران میں بیٹھے ڈنر کھاتے اور باتیں کرتے رہے۔ پھر اُٹھ کر ریلوے اسٹیشن واپس آئے تو ماسکو جانے والی ہماری گاڑی پہلے سے پلٹ فارم پر تیار کھڑی تھی۔ ہم ٹکٹوں پر اپنی بوگی اور سیٹوں کا نمبر دیکھ کر گاڑی پر سوار ہوئے۔

یہاں بھی پہلی گاڑی کی طرح کوپے بنے تھے۔ ایک ایک کوپے میں چار آدمیوں کے بیٹھنے اور سونے کی جگہ تھی۔ لیکن پہلی گاڑی اور اس گاڑی میں فرق یہ تھا کہ ان کوپوں میں بستر رکھے دیئے گئے تھے جو کہ مسافروں کو خود ہی بنانے پڑتے تھے۔ کوپے میں کھانے پینے کا سامان بھی نہیں تھا۔ پاول کوپے میں آتے ہی کہنے لگا یہ سوویت یونین کی بنائی ہوئی گاڑی ہے۔ میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا نہیں یہ روسی گاڑی ہے جبکہ جس گاڑی میں ہم آئے تھے وہ سوویت گاڑی تھی۔ پاول میرا جواب سن کر کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ کہنے لگا تمہیں سوویت یونین پسند تھا اس لئے تم ہر اچھی چیز سوویت یونین سے منسوب کر رہے ہو۔ میں نے جواب دیا ہاں اچھی چیزوں کو اچھا کہنا ہی چاہئے۔ پورے نو بجے گاڑی سینٹ پیٹرزبرگ کو خیر باد کہہ کر ماسکو کی طرف روانہ ہوئی۔

جس ٹرین سے ہم آئے تھے اُس کی طرح یہ ٹرین بھی الیکٹرک ٹرین تھی۔ لیکن گاڑی کے چلنے کے انداز سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ یہ گاڑی پہلے والی ٹرین سے مختلف ٹریک پر چل رہی تھی۔

یوں تو روس کے پاس اپنا تیل اور گیس ہے لیکن روس میں سب گاڑیاں اور بسیں شہروں کے اندر الیکٹرسٹی سے چلتی ہیں۔ جس کی وجہ سے مجھے ماسکو اور سینٹ پیٹرزبرگ کے ماحول میں بہت شفافیت اور

پاکیزگی دکھائی دی۔ کہیں پٹرول یا ڈیزل کی بو نہ آئی۔ دونوں شہروں میں روزانہ سڑکیں دُھلنے کی وجہ سے کہیں گردو غبار کا بھی کوئی نام ونشان نہیں تھا۔

خوش قسمتی سے واپسی پر بھی ہمارے کوپے میں چوتھا مسافر غائب تھا۔ چنانچہ ہم بستر بنا کر اُن پر دراز ہو گئے۔ چونکہ دن بھر کے تھکے ہوئے تھے اس لئے تھوڑی دیر باتیں کرتے کرتے سب نیند کی آغوش میں چلے گئے۔

صبح چار بجے کے قریب گاڑی کے اندر الارم سسٹم سے سب کی آنکھ کھلی تو گاڑی ماسکو کی حدود میں داخل ہو چکی تھی۔ سب نے یکے بعد دیگرے ریسٹ روم جا کر ہاتھ منہ دھوئے اور دھند میں ڈوبے ماسکو کے ریلوے اسٹیشن پر گاڑی سے اتر کر چند بلاک دور گھر جانے کے لئے میٹرو اسٹیشن پہنچے۔

میٹرو صبح دو بجے سے ساڑھے پانچ بجے تک بند کر دی جاتی ہے۔ اس لئے میٹرو اسٹیشن کے باہر لوگوں کی بہت بڑی تعداد میٹرو اسٹیشن کھلنے کی منتظر تھی۔ پاول گھر جانے کی بجائے اپنے دفتر چلا گیا جب کہ ہم میٹرو کے باہر کھڑے ہجوم میں میٹرو کھلنے کا انتظار کرنے لگے۔

رُوس میں چھٹا دن

میٹرو پر لوگوں کی اتنی بڑی تعداد دیکھ کر میں سوچ رہا تھا کہ کیا برف باری کے موسم میں بھی لوگ اِسی طرح اتنی ہی بڑی تعداد میں میٹرو اسٹیشن کھلنے کا انتظار کرتے ہوں گے۔

علی نے کا کہنا تھا کہ ہاں۔ماسکو کے رہنے والوں کے لئے برف باری کوئی غیر معمولی چیز نہیں ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ برف باری ہو رہی ہو تو کس طرح کا لباس پہننا ہے۔ کس طرح اپنے آپ کو برف باری میں وارم رکھنا ہے۔ کیسے موسم کی درشتگی کے باوجود زندگی کا کاروبار جاری رکھنا ہے۔

ابھی اسٹیشن کھلنے میں پندرہ بیس منٹ رہتے تھے۔ ایک روسی لڑھکتا ہوا اسٹیشن کی سیڑھیوں پر گرا تو چند لوگوں نے آگے بڑھ کر اُسے سہارا دیا۔ لگتا تھا کہ اُس نے علی الصبح شراب پینی شروع کر دی ہے اور وہ نشے میں دُھت ہے۔ روسی شراب پینے کے رسیا ہیں۔ مرد اور خواتین سب پیتے ہیں اور خوب پیتے ہیں۔ شراب نوشی اُن کے کلچر کا حصہ ہے۔ اس لئے سڑکوں پر اکثر ایسے ٹن افراد دکھائی دے جاتے ہیں۔

ریلوے اسٹیشن کے دروازے کھلے تو انسانوں کا ایک جم غفیر اسٹیشن کے اندر داخل ہوا اور چشم زدن میں ٹرینوں کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہم میٹرو پر سوار ہو کر اپارٹمنٹ چلے آئے۔

گھر آکر شیو کی، نہائے دھوئے، کپڑے بدلے ناشتہ کیا اور فیصل کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔

فیصل علی کا دوست ہے۔ کراچی کا رہنے والا ہے۔ ہائی اسکول کر کے نو عمری میں روس چلا آیا تھا۔ یہیں اُس نے باقی تعلیم مکمل کی اور پھر پیزا میں گروسری کا کاروبار شروع کیا۔

پنزا ماسکو سے پانچ سو میل دور سینٹ پیٹر زبرگ کی مخالف سمت میں واقع درمیانے درجے کا ایک اہم شہر ہے۔ جس کی پاپولیشن کوئی پانچ لاکھ افراد پر مشتمل ہے۔

یہ شہر سترھویں صدی میں ایک قلعہ کی تعمیر کے آغاز سے آباد ہوا تھا۔ سوویت یونین کے زمانے میں یہ ایک صنعتی اور تعلیمی مرکز کے طور پر ابھرا۔ انقلاب روس کے آغاز میں بالشویک انقلاب کی سرگرمیوں کی وجہ سے اِسے خاصی شہرت حاصل ہوئی۔ اس وقت بھی یہ اپنے تعلیمی اداروں اور یونیورسٹیوں کی وجہ سے معروف ہے۔ پنزا کی اسٹیٹ یونیورسٹی، انجینئرنگ یونیورسٹی، زرعی یونیورسٹی، آرکیٹیکچرل اور تعمیراتی یونیورسٹی پورے روس میں مشہور ہیں۔ اس کے علاوہ پنزا اپنی ادبی و ثقافتی سرگرمیوں کی وجہ سے بھی خاص اہمیت کا حامل ہے۔

فیصل روس آنے کے بعد پنزا میں آباد ہوا۔ یہیں اُس نے اپنی تعلیم مکمل کی اور پھر یہیں کاروبار کا آغاز کیا۔

ہم نہادھو کر ابھی ناشتے کی ٹیبل پر بیٹھے تھے کہ فیصل کا فون آگیا اور علی اُسے لینے میٹرو اسٹیشن چلا گیا۔ اُن کے آنے تک میں اگلے دن کی سرگرمیوں کے لئے تیار تھا۔ آج میں ماسکو کی معروف زمانہ لوممبا یونیورسٹی دیکھنا چاہتا تھا۔ عرف عام میں لوممبا یونیورسٹی کو پیپلز فرینڈشپ یونیورسٹی بھی کہتے ہیں۔

سوویت یونین کے زمانے میں یہ یونیورسٹی سوویت یونین کی اتحادی ریاستوں کے طالب علموں کا مرکز تھا۔ لاطینی امریکہ، افریقہ اور ایشیا سے طالب علم آکر پیپلز فرینڈشپ یونیورسٹی میں مفت اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے تھے۔ یونیورسٹی میں ہی اُنہیں قیام وطعام کی مفت سہولتیں بھی حاصل تھیں۔

میرے تیار ہونے تک علی فیصل کو ساتھ لئے واپس چلا آیا۔ فیصل بتیس تینتس برس کا نوجوان تھا لیکن سخت محنت اور جانفشانی کے اثرات اُس کی جسمانی ہیت سے عیاں تھے۔

وہ جوش و جذبہ اور خلوص سے بھرپور تھا۔ بہت خندہ پیشانی سے ملا۔ اُس کا معمول تھا کہ وہ ہفتے میں ایک بار اپنے اسٹوروں کی سپلائی خریدنے کے لئے ماسکو آتا۔ وہ سر شام پنزا سے بس پر روانہ ہوتا۔ بس علی الصبح ماسکو پہنچتی۔ وہ ماسکو سے سپلائی خریدتا اور بس پر سوار ہو کر رات دیر گئے پنزا پہنچتا۔ اُس نے اسٹوروں کو چلانے کے لئے دو تین ورکر بھرتی کر رکھے تھے۔

عین جوانی میں اُس کی کمر کا خم اور ریڑھ کی ہڈی کے کھسکے ہوئے مہرے اُس کی سخت محنت اور جانفشانی کا پتہ دے رہے تھے۔

سینٹ پیٹرز برگ روانگی سے پہلے فیصل کا اصرار تھا کہ ہم وہاں جانے کی بجائے ہم پنزا جائیں اور اُس کو میزبانی کا شرف حاصل کریں۔ میں نے روس کا ویزا حاصل کرتے ہوئے درخواست میں پنزا کا ذکر نہیں کیا تھا۔ ویزا اگرچہ اوپن تھا لیکن اِس کے باوجود میں نے مناسب جانا کہ صرف اُس شہر کی سیاحت کی جائے جس کا ویزا کی درخواست میں اندراج کیا تھا۔ فیصل کا کہنا تھا کہ پنزا کے قریب ہی ایک ترکھانی نام کا گاؤں ہے جہاں رُوس کا ہزاروں سال پرانا لائف اسٹائل ابھی تک قائم ہے۔ ہم پسند کریں تو وہ ترکھانی میں ہمارے ایک آدھ دن کے قیام کا بندوبست کرے گا۔ لیکن میں نے اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی وارننگ کو مقدّم جانا کہ جس ملک میں جاؤ اُس کے قوانین کی پابندی کرو۔ چنانچہ میں نے پنزا اور ترکھانی کی سیاحت سے فیصل سے معذرت کر لی۔

فیصل نے رات بھر کے جگراتے کے باوجود ہمیں ماسکو میں گھمانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ ہم ماسکو میں تقریباً ہر اہم جگہ جا چکے تھے۔ تاہم ابھی تک مجھے پیپلز فرینڈ شپ یونیورسٹی جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ میرے ناول شب گزیدہ سحر کی کہانی پیپلز فرینڈ شپ یونیورسٹی کے ارد گرد بنی گئی ہے۔ اس لئے میں پیپلز فرینڈ شپ یونیورسٹی ضرور جانا چاہتا تھا۔

فیصل کو پیپلز فرینڈ شپ یونیورسٹی کے محلِ وقوع کا ٹھیک ٹھیک اندازہ تھا۔ اُس علاقے میں اُس کے چند ایک انڈین دوست بھی رہتے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ اُس علاقے میں جا ہی رہے رہیں تو لگے ہاتھوں اُن سے بھی ملاقات کر لیں گے۔ یہ ایک اچھا خیال تھا۔

اُس نے تازہ ہونے کے لئے باتھ روم میں اپنے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے۔ بالوں میں کنگھی کی اور ہم اپارٹمنٹ سے پیپلز فرینڈ شپ یونیورسٹی جانے کے لئے میٹرو اسٹیشن چلے گئے۔

حسبِ معمول جیسے ہی ہم میٹرو اسٹیشن پہنچے ہماری ٹرین بھی آن پہنچی۔ ہم ٹرین پر سوار ہو کر پہلے رنگ روڈ پر واقع ایک اسٹیشن گئے اور وہاں سے پیپلز فرینڈ شپ یونیورسٹی کے علاقے میں جانے والی ٹرین پر سوار ہو گئے۔ اس روٹ پر چلنے والی میٹرو غیر معمولی طور پر پُر شور تھی۔

آدھ گھنٹے کی مسافت کے بعد ہم پیپلز فرینڈ شپ یونیورسٹی کے علاقے کے اسٹیشن پر اترے تو اسٹیشن کے قریب ہی اپارٹمنٹس کی وہ بلڈنگ تھی جہاں فیصل کا انڈین دوست رہتا تھا۔ اُس اپارٹمنٹ کمپلیکس کا نام تھا ڈپلومیٹک اینکلیو۔ فیصل نے اُس کے سیل پر کال کی تو تھوڑی دیر بعد اُس کا دوست بلڈنگ کے سیکورٹی ڈور سے بر آمد ہوا۔ یہ درمیانے قد قدرے سانولے رنگ کا للن کمار تھا۔ للن کمار رُوس میں ایک انڈین میڈیسن کمپنی کے لئے سیلز منیجر کے طور پر کام کرتا ہے۔ للن کمار نے خوش دلی سے ہمیں خوش آمدید کہا ۔اُس کی بیوی اپنے ننھے منے بچے کے ساتھ اپارٹمنٹ کمپلیکس میں کھیل رہی تھی۔ للن کمار کی خواہش تھی کہ ہم اُس کے اپارٹمنٹ میں چلیں اور اُس کے ساتھ کچھ وقت گزاریں۔ لیکن ہم نے یہی مناسب سمجھا کہ اُس سے اجازت لیں اور پیپلز فرینڈ شپ یونیورسٹی جائیں۔ چنانچہ اُس سے تھوڑی دیر گپ شپ کرنے کے بعد ہم یونیورسٹی کے طرف چل دیئے۔ یونیورسٹی وہاں سے مشکل سے پانچ منٹ کے فاصلے پر واقع تھی۔ چنانچہ ہم پیدل چلتے یونیورسٹی پہنچے۔ سڑک کے ایک طرف یونیورسٹی کی عمارات تھیں جب

کہ دوسری طرف دنیا بھر سے آئے طالب علموں کے لئے ہاسٹلز کی عمارات بنی ہوئی تھیں۔ یونیورسٹی میں چھٹیوں کے باوجود ہاسٹلز کے ارد گرد ہمیں افریقی اور ایشائی ملکوں سے آئے لڑکے اور لڑکیاں چلتے پھرتے دکھائی پڑے۔ اُنہیں دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ سوویت یونین کے خاتمے کے باوجود پیپلز فرینڈ شپ یونیورسٹی نے اپنا بین الاقوامی کردار قائم رکھا ہے۔ لیکن یہ بھی بجا ہے کہ پہلے کہ طرح ان طالب علموں کے لئے اب تعلیم اور رہائش مفت نہیں ہے۔ اب اُنہیں پڑھنے کے لئے فیس ادا کرنا پڑتی ہے اور ہوٹل میں رہائش کے لئے بھی اخراجات برداشت کرنا پڑتے ہیں۔ لیکن یہ بات صرف غیر ملکی طالب علموں پر لاگو نہیں ہوتی۔ روسی طالب علموں کو بھی اب پڑھائی کے لئے فیس ادا کرنا پڑتی ہے۔ جس کی وجہ سے روس میں لٹریسی ریٹ مسلسل گر رہا ہے۔ سوویت یونین کے زمانے میں 98 فیصد روسی پڑھے لکھے تھے۔ دنیا میں یونیورسٹی سے فارغ التحصیل طلبا کا سب سے زیادہ تناسب روسیوں کا تھا۔ لیکن اب یہ تناسب بہت نیچے آ گیا ہے۔ لٹریسی ریٹ بھی 98 فیصد سے گر کر 85 فیصد پر آ گیا ہے۔

اپنا ناول شب گزیدہ سحر لکھتے ہوئے میں نے یونیورسٹی اور یونیورسٹی کے ماحول پر خاصی ریسرچ کی تھی اس لئے مجھے سارا ماحول جانا پہچانا لگا۔ ہاسٹلز کے ساتھ ہی روسی زبان سکھانے کا ڈیپارٹمنٹ تھا جہاں سے میرے ناول کی کہانی شروع ہوتی ہے۔ وہاں چلتے پھرتے طالب علم لڑکوں اور لڑکیوں کو دیکھ کر مجھے اپنے ناول کے کردار بہت یاد آئے۔

ہم یونیورسٹی کے کیفے بھی گئے لیکن چھٹیوں کی وجہ سے کیفے بھی بند تھا۔ چنانچہ وہاں بیٹھ کر چائے پینے یا کچھ کھانے کی خواہش پوری نہ ہو سکی۔

پیپلز فرینڈ شپ یونیورسٹی میں گھومتے اور تصویریں بناتے ہوئے دن کے تین بج چکے تھے۔ آسمان پر ہلکے ہلکے بادل تیر رہے تھے۔ بھوک خوب چمک اٹھی تھی۔فیصل نے بتایا کہ یونیورسٹی ہاسٹلز میں سے ایک کے پاس،ہی ایک انڈین ریسٹورانٹ واقع ہے۔اگر ہم دیسی کھانا پسند کریں تو وہاں لنچ کیا جاسکتا ہے۔

ماسکو میں پیپلز فرینڈشپ کا سامنے کا منظر
اب بھی یہ یونیورسٹی ایشیا، افریقا اور لاطینی امریکہ کے بے شمار
طالب علموں کی علمی ضروریات پوری کر رہی ہے

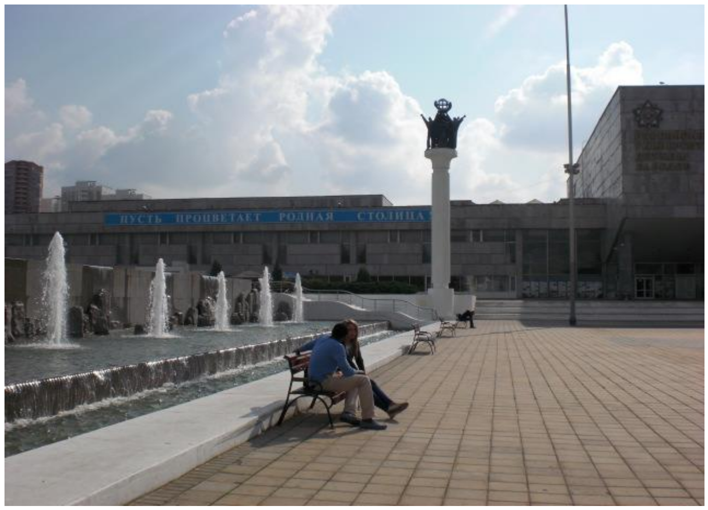

پیپلز فرینڈشپ یونیورسٹی کا فرنٹ لان

میں جب سے ماسکو آیا تھا میں نے دیسی کھانا نہیں کھایا تھا۔ چنانچہ فیصل کی آفر مجھے اچھی لگی۔ انڈین ریستوران میں کھانا کھانے کا فیصلہ کر کے ہم نے یونیورسٹی کمپاونڈ سے نکل کر سڑک کراس کی اور دوبارہ ہاسٹلز کے ایریئے میں چلے آئے۔ یہ انڈین ریستوران ایک ہاسٹل کی عمارت کی بغل میں ایک بیس مینٹ میں بنایا گیا تھا۔ جس میں جانے کے لئے بیس مینٹ میں چند سیڑھیاں اُترنا پڑتی تھیں۔

بیس مینٹ کی یہ سیڑھیاں اُتر کر ہم ریستورانٹ میں داخل ہوئے تو ریسٹورانٹ والوں نے خاصہ اچھاماحول تخلیق کر رکھا تھا۔ شاید کچن میں کوئی انڈین ہو تو ہو لیکن کاؤنٹر پر قازقستان کی تین لڑکیاں کام کر رہی تھیں۔ اُنہوں نے ہمیں روسی زبان میں خوش آمدید کہا۔

میں نے پالک پنیر جب کہ فیصل نے کڑاہی چکن اور علی نے بریانی آرڈر کی۔ خلافِ معمول خوراک بہت اچھی بنی ہوئی تھی۔ سب نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ اُس وقت ہمارے علاوہ دو یا تین روسی کسٹمر ریسٹورانٹ میں کھانا کھا رہے تھے۔ شاید زیادہ کسٹمر نہ ہونے کی وجہ سہ پہر کا وقت تھا۔ سہ پہر کے وقت نہ کوئی لنچ کھاتا ہے نہ ڈنر۔ پھر بھی تین چار روسیوں کی کھانے کے لئے موجودگی غنیمت تھی۔ ہم لیٹ لنچ سے فارغ ہوئے تو دن کے چار سوا چار بج رہے تھے۔ ہم ریسٹورانٹ میں چائے نہیں پینا چاہتے تھے اس لئے بل ادا کر کے وہاں سے اُٹھ آئے۔ باہر نکلے تو تھوڑی دور ہمیں ایک کیفے دکھائی دیا۔ کیفے میں باہر اوپن ائیر میں بیٹھنے کی جگہ بنی تھی۔ ہم نے وہاں بیٹھ کر چائے آرڈر کی۔ آسمان پر بادل قدرے گہرے ہونے لگے تھے۔ خیال تھا کہ جلد ہی بارش برسنے لگے گی۔ لیکن ہمارے وہاں چائے پینے تک بارش نہ ہوئی۔ تاہم جب چائے پینے کے بعد ہم پیدل چلتے میٹرو اسٹیشن پہنچے تو ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی۔

لیکن اُس وقت بوندا باندی سے ہمیں کوئی پریشانی نہ ہوئی کیونکہ ہم پہلے ہی میٹرو اسٹیشن کے اندر داخل ہو چکے تھے۔ امکان اِسی بات کا تھا کہ جب ہم اپنے علاقے میں میٹرو سے باہر آئیں گے تو شاید وہاں بارش نہ ہو رہی ہو۔

میٹرو کے ایک اسٹیشن پر فیصل نے ہم سے ہماری رُوس کی اگلی سیاحت کے دوران پینزا آنے کا وعدہ لیا اور پھر ہمیں خدا حافظ کہہ کر ٹرین سے اُتر گیا۔ اُسے وہاں سے پینزا جانے کے لئے بس پکڑنا تھی۔

جب تک ہم واپس اپارٹمنٹ پہنچے تھکاوٹ سے بُرا حال ہو رہا تھا۔ ہم منگل کی رات سینٹ پیٹرزبرگ کے لئے روانہ ہوئے تھے۔ بدھ کے روز سارا دن سینٹ پیٹرزبرگ میں گھومے پھرے تھے۔ بدھ کی رات سینٹ پیٹرزبرگ سے ٹرین پکڑ کر جمعرات کی صبح ماسکو واپس پہنچے تھے۔ واپسی پر پنزا سے فیصل چلا آیا تھا ۔ پھر اُس کے ساتھ پیپلز فرینڈشپ یونیورسٹی دیکھ کر آرہے تھے۔ دو دن اور دو راتوں تک مسلسل حرکت کے بعد تھک جانا فطرتی بات تھی۔ اِس لئے اپارٹمنٹ واپس پہنچتے ہی بستروں پر گر گئے۔ ابھی تھوڑی دیر لیٹے ہوں گے کہ پاول اپنے دفتر سے واپس چلا آیا۔

پاول نے دفتر سے آکر ڈنر تیار کیا۔ ڈنر تیار ہوا تو ہم بھی اُٹھ کر کچن میں چلے آئے۔ وہاں ہم تینوں نے مل کر پہلے ڈنر کیا اور پھر کافی دیر تک بیٹھے گپ شپ کرتے رہے۔ رات گئے میں نے علی اور پاول کو شب بخیر کہا اور دوبارہ اپنے بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ علی اور پاول اب تک بیٹھے روسی میں گفتگو کر رہے تھے کہ میں دوبارہ نیند کی وادیوں میں کھو گیا۔

رُوس میں آخری دن

آج جمعہ کا دن تھا اور اگلے دن صبح ساڑھے چھ بجے ہماری فلائٹ تھی۔ گویا یہ ماسکو میں ہمارا آخری دن تھا۔ میں چاہتا آخری دن ماسکو میں کچھ اِس طرح گزارا جائے جس کی یادیں ہمیشہ کے لئے میرے دل و دماغ پر نقش ہو جائیں۔

ماسکو بہت بڑا شہر ہے اور تاریخی واقعات و مقامات سے بھرا پڑا ہے۔ ایک ہفتے میں کوئی چاہے بھی تو ماسکو کے اِن تاریخی واقعات اور مقامات کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ میں خوش نصیب تھا کہ مجھے رُوس کے اِس سفر میں علی جیسے مخلص، مہربان اور انتہائی نفیس دوست کا ساتھ میسر تھا۔ روسی زبان و ثقافت اس طرح علی میں رچا بسا ہے جیسے گل میں خوشبو۔ وہ رُوسی اِس طرح بولتا ہے جیسے اپنی مادری زبان پنجابی۔ اُس کا لب ولہجہ اور تلفظ بالکل رُوسیوں سے ملتا جلتا ہے۔ اُس کی وجہ سے میری پاول جیسے انتہائی نفیس انسان سے ملاقات ہوئی جس نے نہ صرف اپنے قیمتی کاروباری وقت میں سے بہت سا وقت ہماری معیت میں گزارا بلکہ ہمیں رُوسیوں کے طرح ہر اُس مقام پر لے کر گیا جہاں رُوسی تاریخ کی پرچھائیاں اب بھی اِس طرح جھلملا رہی ہیں کہ لگتا ہے وہ واقعات ابھی ابھی رونما ہوئے ہیں۔

جمعہ کی صبح ہم کوئی نو بجے کے قریب بیدار ہوئے۔ روٹین کے مطابق پاول نے اٹھ کر ہمارے لئے انڈوں کا آملیٹ بنایا۔ چائے بنائی اور رات کی بچی ہوئی گرچکا پلیٹوں میں ڈال کر ناشتے کی تیاری کا اعلان کیا۔ گرچکا گندم ہی کی قسم کی دلیہ نما چیز ہے جو کہ رُوسیوں کی غذا کا اہم حصہ ہے۔ میں نے رُوس آتے ہی پاول کو

بتایا تھا کہ میں شوگر کی وجہ سے خوراک میں بہت احتیاط کرتا ہوں اِس لئے وہ برائے کرم کھانے بنانے میں تکلّفات سے کام نہ لے۔

شوگر کا سُن کر پاول نے کہا کہ وہ دیگر چیزوں کے علاوہ روزانہ میرے لئے گرچکا بنائے گا۔ گرچکا شوگر کے لئے بہت مفید ہے۔ اِس کے کھانے کے بعد شوگر بالکل نہیں بڑھتی۔

ایک دو دن گرچکا کھانے کے بعد مجھے پاول کی بات درست محسوس ہوئی۔ میں نے پاول کے بنائے چکن اور سلاد کے ساتھ گرچکا سے ڈنر اور ناشتہ کیا اور دن میں کئی بار شوگر چیک کی لیکن شوگر میں بالکل اضافہ نہ ہوا۔

رُوس کے اِس سفر میں مجھے اپنی صحت کے حوالے سے سب سے اہم تحفہ گرچکا کا ملا۔ میں نے رُوس ہی سے اپنے بیٹوں کو اِی میل بھجوائی کہ وہ مقامی رُوسی گروسری اسٹور سے گرچکا خرید لائیں۔ کیونکہ میں رُوس سے واپسی کے بعد گرچکا کو مستقل طور پر اپنی خوراک کا حصہ بنانا چاہتا ہوں۔ امریکی انگریزی میں گرچکا کے لئے بک ویٹ کا نام استعمال ہوتا ہے۔ بک ویٹ فوڈ کے عام امریکی اسٹوروں پر مل جاتی ہے۔ یہ دیکھنے میں موٹے دلیئے کی طرح دکھائی دیتی ہے۔ رُوسی اِسے چاولوں کی طرح اُبال کر کھاتے ہیں۔

بہر حال پاول کے ناشتے کے اعلان نامے کے بعد ہم نے اُس کا بنایا ہوا ناشتہ کیا اور تیار ہو کر اُس کے اپارٹمنٹ سے میٹرو اسٹیشن کی طرف روانہ ہوگئے۔ پاول کئی دنوں سے اپنے دفتری کام کا کافی حصہ ہمارے ساتھ گزار رہا تھا۔ ہم نے اُس سے درخواست کی کہ وہ دفتر جائے اور اپنے کاروباری امور سے فارغ ہو کر ہم سے آن ملے۔ علی کچھ اور مقامات دیکھنا چاہتا تھا لیکن میں نے علی سے کہا کہ آج ماسکو میں ہمارا آخری دن ہے آج میں سنٹرل ماسکو کے اُن حصوں میں گھومنا پھرنا چاہتا ہوں جہاں عام رُوسی اپنے انداز سے زندگی گزارتے ہیں۔ آج تک ماسکو اور سینٹ پیٹرز برگ میں جو کچھ دیکھا ہے اُس کے بارے

میں سوچنا چاہتا ہوں اور اُسے اپنے ذہن میں مناسب طور پر ترتیب دینا چاہتا ہوں۔ اِس کے بعد جب شام ماسکو کے درو بام پر اترنے لگے تو بالشوئی تھیٹر میں کوئی پلے دیکھنا چاہتا ہوں اور اُس کے بعد گھر واپس جا کر اپنا بیگ پیک کرنا چاہتا ہوں کیونکہ ہمیں صبح تین بجے ائیر پورٹ جانا ہے۔ علی نے میری باتوں سے اتفاق کیا۔ ہم نے پاول سے کہا کہ وہ جب جی چاہے کریملن کے آس پاس چلا آئے تو ہم اُسے وہیں مل جائیں گے ۔ پھر مل کر کہیں ڈنر کریں گے اور اُس کے بعد بالشوئی تھیٹر میں پلے دیکھیں گے ۔ پاول کو بھی یہ آئیڈیا اچھا لگا۔ اِس مشورے کے بعد ہم تینوں میٹرو میں بیٹھ کر سنٹرل ماسکو کی طرف روانہ ہوئے۔ پاول ہم سے بہت پہلے اپنے دفتر کے ایک قریبی اسٹیشن پر اتر گیا جب کہ ہم نے کریملن کے میٹرو اسٹیشن پر میٹرو کو خیر باد کہا اور کریملن کے باہر خوانچہ فروشوں کے پاس جا پہنچے۔ میں اپنی فیملی کے لئے کچھ تحائف خریدنا چاہتا تھا۔ خاص طور پر اپنے پوتے کے لئے ماسکو کی یاد گار کے طور پر کچھ کپڑے خریدنے کا ارادہ تھا۔ میٹرو اسٹیشن سے نکل کر سڑک پار کر کے ہم خوانچہ فروشوں کے پاس آئے تو ایک تبتی میاں بیوی بچوں کے لئے ماسکو کے امیجز کے ساتھ ٹی شرٹس بیچ رہے تھے۔ میں نے اُن سے دو ٹی شرٹس خریدیں۔ جس کے اُنہوں نے چھ سو روبل مانگے۔ میں نے کچھ کم کرنے کے لئے کہا تو کہنے لگے ہم ملازم ہیں۔ یہ سب خوانچے ایک رُوسی کے ہیں اور ہمیں قیمتیں کم کرنے کی اجازت نہیں۔ یہ بات چند دن پہلے بھی میں نے ایک خوانچہ فروش سے سُنی تھی۔ وہ ایک غیر ملکی خاتون تھی۔ اُس نے پانی کی بوتل کے ساٹھ روبل مانگے تو میں نے اُسے کہا پانی کی بوتل کے لئے ساٹھ روبل بہت زیادہ ہیں۔ اُس نے بھی جواب دیا تھا جی ہم تو ملازم ہیں یہ سارے خوانچے ایک رُوسی کے ہیں۔

آج دوسری بار یہی ڈائیلاگ سن کر مجھے پاکستان کے بہت سے خوانچہ فروش یاد آئے جو خوانچوں پر پھل، سبزیاں اور کھانے پینے کا سامان بیچ کر اپنے اہل وعیال کی پرورش کرتے ہیں۔

سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد رُوس بہت سے مافیاز کے کنٹرول میں ہے۔ شاید خوانچوں کا مالک بھی کوئی بڑا باس تھا جو کہ بڑے بڑے افسروں کی اشیر واد سے ماسکو میں خوانچے چلا رہا تھا اور غریب ملازمین کا استحصال کر رہا تھا۔ سامراجی طاقتیں رُوس کے ساتھ بھی شاید وہی کرنا چاہتی ہیں جو اُنہوں نے دنیا کے اور بہت سے ممالک کے ساتھ کیا ہے۔

خیر کچھ اور تحفے خرید کر ہم کریملن کے عقب کی طرف پیدل چلنا شروع ہو گئے۔ سینٹ بسیلی کے چرچ کے پاس سے گزرتے ہوئے جب ہم بالکل کریملن کے عقب میں پہنچے تو وہاں ہمیں ایک مختلف ماسکو دکھائی دیا۔ کریملن سے اور دور گئے تو ایک اسٹریٹ میں ہمیں ایک جمعہ بازار دکھائی دیا۔ جس میں ایک چھوٹی سی سڑک کو بلاک کر کے دونوں طرف کپڑے کے خیموں میں طرح طرح کی مصنوعات کی دوکانیں سجائی گئی تھی۔ زیادہ دوکانیں اشیائے خوردونوش پر مبنی تھیں۔ کچھ کپڑوں اور کچھ دیگر مصنوعات کی دوکانیں تھیں۔ تقریباً سبھی دوکانوں پر رُوسی عورتیں بیٹھی مصنوعات بیچ رہی تھیں۔ لیکن گاہکوں میں مرد اور خواتین سبھی شامل تھے۔

میں نے علی سے کہا کہ یہ حقیقی ماسکو ہے۔ جہاں نہ کسی بڑے آدمی کی گاڑی ہے اور نہ کوئی بڑا آدمی شاپنگ کر رہا ہے۔ سب عام رُوسی ہیں۔

مجھے ماسکو کی یہ صورت دنیا کے بہت سے شہروں جیسی لگی جہاں زندگی بغیر کسی میک اپ کے اپنی اصل شکل میں دکھائی دیتی ہے۔ شہر کے اِس حصے میں بھی ہمیں کئی قدیم چرچ دکھائی دیئے۔ کئی ایک تو کئی کئی سو سال پرانے تھے لیکن ابھی تک اِن کی عمارات کی شان و شوکت قائم تھی۔ ماسکو میں اسٹالن دور میں تعمیر کی گئی سات ایک جیسی عمارتوں میں سے ایک ہمیں شہر کے اِس حصے میں بھی دکھائی دی۔ ایسی عمارات میں سے ایک میں وزارت داخلہ اور ایک میں وزارت خارجہ واقع ہے۔

ہم شہر کے اِس حصے میں تقریباً چار گھنٹے تک گھومتے پھرتے رہے۔ جب تھکاوٹ محسوس ہوئی تو میٹرو پر سوار ہو کر بالشوئی تھیٹر پہنچ گئے۔ پاول ابھی تک اپنے دفتر میں تھا۔ اِس دوران اس نے کئی بار کال کر کے ہماری خیریت اور ہمارے سیاحتی علاقے کے بارے میں استفسار کیا۔ آخری بار اُس سے بات ہوئی تو اُس نے بتایا کہ وہ دفتر سے گھر جا چکا ہے اور گھر سے گاڑی لے کر بالشوئی تھیٹر آ رہا ہے۔

بالشوئی تھیٹر رُوس کے اہم ترین اور دنیا میں مشہور ترین تھیٹروں میں سے ایک ہے۔ جہاں رُوس کے نامور ترین ڈرامے اور بیلے کے فنکار سوویت دور اور سوویت دور کے بعد روسی فیڈریشن کے دور میں اپنے فن کا مسلسل مظاہرہ کرتے چلے آ رہے ہیں۔

بالشوئی تھیٹر کی راہداریوں میں اُن سب فنکاروں کی تصاویر آویزاں تھیں جو کسی بھی زمانے میں اِس تھیٹر میں پرفارم کر چکے ہیں۔ بالشوئی تھیٹر پہنچ کر ہم نے حالیہ پلیز کے بارے میں استفسار کیا تو پتہ چلا کہ پلے ایز کا سیزن ستمبر میں شروع ہو گا۔ آج کل صرف ایک بیلے چل رہا ہے۔ جس میں داخلے کی ٹکٹ ۹ سو روبل پر پرسن ہے۔

ہم نے تین ٹکٹ خریدے اور باشوئی تھیٹر سے باہر نکل آئے۔ ابھی بیلے شروع ہونے میں ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا۔ پاول کی کال آئی کہ وہ ٹریفک میں پھنسا ہے اِس لئے مناسب ہو گا کہ ہم ڈنر کر لیں تاکہ بیلے شروع ہونے سے پہلے ڈنر سے فارغ ہو جائیں۔

بالشوئی تھیٹر کی عقبی سڑک پر کئی آوٹ ڈور ریستوران تھے۔ جن کے سامنے خوبصورت رُوسی لڑکیاں دیدہ زیب ملبوسات پہنے آنے جانے والوں کو ڈنر کے لئے اپنے اپنے ریستورانوں میں آنے کی دعوت دے رہی تھیں۔

علی نے پوچھاڈنر میں کیا کھایا جائے۔ میں نے جواب دیا کہ ہم وہی اپنی فیورٹ ڈش گرچکا سلاد کے ساتھ پیٹ بھر کر کھائیں گے۔

ہم نے ایک ریستوران میں آنے کی دعوت دینے والی لڑکی سے جو شکل و صورت سے اُزبک دکھائی دیتی تھی پوچھا کہ آیا اُس کے ریستوران میں گرچکا موجود ہے۔اُس نے اثبات میں جواب دیا تو ہم اُس کے ریستوران میں بیٹھ گئے۔

اتنے دنوں میں مجھے روسی پڑھنے میں تھوڑی شدھ بدھ ہو گئی تھی۔ الفاظ سے بھی کچھ کچھ شناسائی ہونے لگی تھی۔ میں نے ریستوران میں بیٹھتے ہی مینیو دیکھا تو گرچکا کی پلیٹ کی قیمت ۹ سو روبلز دکھائی دی۔ میں نے علی سے کہا کہ یہ ریستوران لوٹ مار کا اڈا دکھائی پڑتا ہے بہتر ہو گا ہم کہیں اور ڈنر کر لیں۔ لیکن علی اب وہاں سے اُٹھنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ماسکو میں اپنی آخری شام ہم نے دو ہزار روبلز میں سلاد اور گرچکا کی دو پلیٹیں کھائیں۔ یہ دو ہزار روبلز ہم نے ۸۰ ڈالروں کی شکل میں ادا کیئے۔ ہم نے ڈنر ختم کیا تو علی بھی بالشوئی تھیٹر کے سامنے ایک قریبی سڑک پر گاڑی پارک کر کے وہاں پہنچ گیا۔ ہم نے اُسے ڈنر کرنے کے لئے کہا لیکن اُس نے بیلے شروع ہونے میں وقت کی کمی کی وجہ سے اپنا ڈنر بیلے کے ہالف ٹائم تک موخر کر دیا۔

ہم تینوں ریستوران سے چلتے بالشوئی تھیٹر واپس پہنچے تو تھیٹر میں داخلہ شروع ہو چکا تھا۔ بہت سے خواتین و حضرات جو ٹکٹ خریدنے میں ناکام رہے تھے آواز لگا رہے تھے کہ اگر کوئی فالتو ٹکٹ فروخت کرنا چاہے تو وہ خریدنے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن وہاں کوئی ٹکٹ بیچنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ لوگوں کا بیلے کے لئے جوش و خروش دیدنی تھا۔ یہ جوش و خروش میں نے اِس سے پہلے نیویارک میں براڈوے کے پلے ایز میں دیکھا تھا یا اب یہاں دیکھ رہا تھا۔ بالشوئی تھیٹر کا سارا ہال کھچا کھچ بھرا تھا۔ تماشائیوں میں عمر کی کوئی تمیز

نہیں تھی۔ نو عمر بچوں، جوانوں، بوڑھوں تک ہر عمر کے مرد اور عورتیں بلے انجوائے کرنے کے لئے تھیٹر میں موجود تھے۔

بیلے کے آغاز سے پہلے اناؤنسر نے پہلے رُوسی اور پھر انگریزی میں اعلان کیا کہ تمام لوگ اپنے سیل فون بند کر دیں۔

ہال کی لائٹیں آف ہوئیں اور اسٹیج کے فلور سے میوزک ماسٹر کا سر اور ہاتھ میں پکڑی چھڑی دکھائی دی تو سارے ہال میں تالیوں کا شور مچ گیا۔ لوگوں نے دل کھول کر بیلے کے آغاز کا استقبال کیا۔

اسٹیج پر ایک پہاڑی گاؤں کا انتہائی خوبصورت سین تخلیق کیا گیا تھا۔ سین میں پہاڑ، پہاڑوں سے بہتی ایک ندی، ندی کے ارد گرد اونچے درخت اور درختوں کے پہلو میں ایک دیہاتی گھر بنایا گیا تھا۔ اس گاؤں کے پیش منظر میں رقص کرتی ایک الہڑ دوشیزہ نمودار ہوئی جس کے انگ انگ سے جوانی اور محبت کی خواہش پھوٹ رہی تھی۔ لڑکی کا گھر گاؤں کے ایک کنارے پر واقع ہے جب کہ دوسرے کنارے پر ایک اور گھر ہے جس سے ایک لڑکا ڈانس کرتا ہوا اسٹیج پر نمودار ہوا۔ بیلے کی حرکات میں دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں تو محبت کا کھیل شروع ہو جاتا ہے۔ لڑکی کی ماں کو اُس کی محبت میں گرفتاری کا پتہ چلتا ہے تو وہ اُسے محبت میں پیش آنے والے خطرات سے آگاہ کرتی ہے۔ لڑکی ماں کو تسلی دیتی ہے اور کسی بھی قسم کے خطرات کو خاطر میں لائے بغیر محبت کا کھیل جاری رکھنے کا عندیہ دیتی ہے۔ اُس کی سہیلیاں بھی اِس کھیل میں اُس کا ساتھ دیتی ہیں۔ لڑکی کی ماں جب لڑکی کے عزم کو مضبوط پاتی ہے تو وہ بھی اُسے اِس نوجوان سے محبت جاری رکھنے کی اجازت دے دیتی ہے۔

پھر اِس محبت میں ایک ولن نمودار ہوتا ہے۔ جو نہیں چاہتا کہ لڑکے اور لڑکی کی محبت پروان چڑھے۔ وہ لڑکے اور لڑکی دونوں کو دھمکیاں دیتا ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے سے دور رکھنے کے لئے طرح طرح

کے جتن کرتا ہے لیکن اُس کا ہر حربہ ناکام ہو جاتا ہے۔ پھر کہانی میں ایک اور کردار داخل ہوتا ہے۔ یہ اپنے دور کا شہزادہ ہے۔ وہ اپنی فوجوں کے ساتھ گاؤں سے گزرتا ہے اور اُس لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی ماں اور بہت سارے فوجیوں کے ساتھ گاؤں میں آتا ہے ۔ وہ لڑکی اور اُس کی ماں کو بلاتے ہیں۔ شہزادے کی ماں بھی لڑکی کو پسند کرتی ہے۔ وہ اپنی پسندیدگی کا اظہار کرنے کے لئے اپناہار اُتار کر لڑکی کے گلے میں ڈال دیتی ہے۔ لڑکی کی ماں لڑکی کو سمجھاتی ہے کہ وہ اپنے دیہاتی عاشق کو بھول جائے اور شہزادے سے شادی کرلے لیکن لڑکی بضد رہتی ہے کہ وہ اُسی دیہاتی نوجوان سے محبت کرتی رہے گی۔ ماں جب زیادہ دباوڈالتی ہے تو لڑکی شہزادے کی ماں کا دیاہواہار اپنے گلے سے اُتار کر اپنی ماں کے گلے میں ڈال کر علامتی انداز میں اِس بات کا اظہار کرتی ہے کہ اُسے شہزادے یا اُس کی دولت سے کچھ لینادینانہیں ہے۔

اِس اثنامیں ولن کی سازشیں بھی جاری رہتی ہیں۔ وہ کہانی میں شہزادے کی آمد سے خوش بھی ہوتا ہے کہ اب لڑکی اگر اُسے نہیں ملے گی تو کم از کم اپنے عاشق کو بھی نہیں ملے گی۔ اِس لئے وہ اپنادباو لڑکی اور اُس کے عاشق پر جاری رکھتا ہے۔ لڑکی کی ماں بھی شہزادے کی طرف داری کا سلسلہ جاری رکھتی ہے۔ یہاں تک کہ لڑکی ایک دن بددل ہو کر شہزادے کی وہاں چھوڑی ہوئی تلوار سے خودکشی کرلیتی ہے۔ اُس کی خودکشی سے اُس کے عاشق کا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ غم سے نڈھال ہو جاتا ہے۔ ولن اُس کے زخموں پر نمک پاشی کے لئے اُسے ایک سیاہ چادر کا تحفہ دیتا ہے اور اُس سے کہتا ہے کہ وہ اپنی محبوبہ کے غم میں ساری عمر سیاہ چادر اوڑھے رکھے۔

کہانی یہاں پہنچی تو بیلے میں وقفہ ہو گیا۔ لوگ سیٹوں سے اُٹھ کر بالشوئی کے ہال وے میں چلے آئے۔ وہاں آئیس کریم، چائے، مشروبات اور سینڈوچز کے ٹھیلے لگے تھے۔ چنانچہ اپنی اپنی خواہش اور ضرورت کے

مطابق کوئی آئیس کریم کھا رہا تھا۔ کوئی سوڈا پی رہا تھا۔ کوئی چائے پی رہا تھا اور کوئی سینڈوچ کھا رہا تھا۔ وہ سب بیلے کے سحر میں جکڑے ہوئے تھے اور سب بیلے کی اب تک کی کہانی اور پرفارمینس کی باتیں کر رہے تھے۔ ایک بڑی عمر کی روسی عورت دوسری سے کہہ رہی تھی بالشوئی میں بیلے دیکھنا اُس کی زندگی بھر کا زندگی بھر کا خواب تھا جو آج پورا ہوا ہے۔ اُس کا لہجہ اور آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی کہ وہ واقعی بیلے دیکھ کر بہت خوش ہے۔

وقفہ کے بعد ہال میں واپس آئے تو اناؤنسر نے دوبارہ لوگوں کو پہلے روسی اور پھر انگریزی میں اپنے سیل فون بند رکھنے کی یاد دہانی کرائی۔ بیلے کے بعد از وقفہ حصے کے لئے پردہ اُٹھا تو اسٹیج پر ایک نیم اندھیری رات میں قبرستان کا سین تھا۔ ندیا اب بھی بہہ رہی تھی۔ نیم اندھیری رات کے اِس سین میں کئی قبریں اور قبروں پر لگے کراس دکھائی دے رہے تھے۔ لڑکی کی سہیلیاں غم واندوہ کی تصویریں بنیں سفید رنگ کے انتہائی باریک لباسوں میں ملبوس اسٹیج پر نمودار ہوئیں۔ قبرستان سے کچھ دور ایک چرچ کے قریب میری کا مجسمہ رکھا تھا۔ لڑکی کی سہیلیوں نے لڑکی کی قبر سے لوٹس کے دو پھول لا کر میری کے مجسمے کے سامنے رکھ دیئے۔

ایسے میں ولن اسٹیج پر نمودار ہوا اور اُس نے میری کے مجسمے کے سامنے رکھے لوٹس کے وہ پھول اُٹھانے کی کوشش کی اور میری کے مجسمے سے اِس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ لڑکی اُسے لوٹا دے۔ لیکن اُس کے جواب میں میری کے مجسمے سے نکلنے والی بجلی کی کرنٹ کی لہروں نے اُس کی سرزنش کی۔ میری سے مایوس ہو کر اُس نے بھاگ کر لڑکی کی قبر کی طرف جانا چاہا لیکن لڑکی کی سہیلیوں نے بڑے طریقے کے ساتھ اُسے لڑکی کی قبر کی طرف جانے سے روک دیا اور آہستہ آہستہ اپنے گھیرے میں لئے اُسے گاؤں سے باہر نکال دیا۔

ولن کے گاؤں سے نکالے جانے کے بعد لڑکی کا عاشق سیاہ لباس میں ملبوس وہی سیاہ چادر لپیٹے اسٹیج پر نمودار ہوا۔ وہ غم واندہ کی تصویر دکھائی دے رہا تھا اور غم سے بُری طرح نڈھال تھا۔ وہ اِس حال میں بھی اپنی محبت کا متلاشی دکھائی دے رہا تھا۔ اُس نے بھی اپنے ہاتھوں میں لوٹس کے بہت سے پھول اُٹھا رکھے تھے جو اُس نے میرے کے قدموں میں جا کر رکھ دیئے۔ ایسے میں اُس پر آسمان سے لوٹس کے سفی پھولوں کی بارش ہوئی۔ اُس نے وہ پھول ایک ایک کر کے اُٹھا لئے اور اپنی محبوبہ کی تلاش شروع کر دی۔ وہ جانتا ہے کہ اُس کی محبوبہ اب اِس دنیا میں نہیں ہے۔ لیکن اُس کو یقین ہے کہ اُس کی سچی محبت اُسے اس دنیا میں لوٹنے پر مجبور کر دے گی۔ اُس کی خواہش کی شدت نے ایک عالم رویا تخلیق کیا جس میں اُس کی محبت اُس کی طرف کھنچی چلی آتی ہے۔ وہ کبھی اُس کے بہت قریب آجاتی ہے اور کبھی دور چلی جاتی ہے۔ عالم رویا میں آخیر تک لڑکے اور لڑکی کے قریب اور دور جانے کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ لڑکی کی سہیلیوں نے عالم رویا میں اِس قربت و دوری کے سین بھرپور شرکت کی اور بیلے کی حرکات و سکنات سے ایک طرف کہانی کے حسن میں اضافہ کیا اور دوسری طرف لڑکے اور لڑکی کے محبت کے تاثر کو مزید گہرائی عطا کی۔

کہانی کے انجام پر ولن اپنی ناکامی کی وجہ سے پاگل ہو گیا۔ لڑکی عالم رویا میں واپس اپنی دنیا میں چلی گئی اور اُس کا عاشق اپنی سیاہ چادر ایک ہاتھ سے کھینچتے ہوئے اپنی دنیا میں واپس چلا گیا۔

کہانی کے شروع سے لے کر آخر تک موسیقی کی دُھنوں کے اُتار چڑھاو اور بیلے کی حرکات سے ایسا سماں بندھا کہ کہانی کے ہر موڑ پر ناظرین نے بے تحاشہ داد دی۔ داد کے طریقے، سلیقے اور شدت سے روسیوں کے اپنی ثقافت سے لگاؤ اور اُس کی تحسین کے جذبے کا پتہ چلتا تھا۔

میں نے اپنی زندگی میں بے شمار بیلے دیکھے ہیں۔ لیکن اتنا خوبصورت اور اتنی خوبصورتی سے پیش کیا گیا بیلے میں نے آج تک کہیں نہیں دیکھا۔ اِس پر لوگوں نے جس طرح فن کاروں کی پذیرائی کی اور جس طرح اُنہیں داد دی اِس کا بھی ایسا خوبصورت اور پُر جوش اظہار میں نے کہیں اور نہیں دیکھا۔ بالشوئی ہال سے نکلتے ہوئے پاول بار بار مجھے پوچھ رہا تھا کہ مجھے بیلے کیسا لگا۔ میری تحسین پر وہ "سپر سپر" کہے چلا جا رہا تھا۔

ہم بیلے سے باہر نکلے تو رات کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ اِس بیلے کو ماسکو میں اپنے آخری منظر کے طور پر یاد رکھوں۔ پاول مصر تھا کہ گھر لوٹنے سے پہلے گورکی پارک میں کیوبا ڈانس دیکھا جائے اور وہاں رُوسی لڑکے اور لڑکیاں جس طرح ایک دوسرے پر اپنی محبت نچھاور کرتے ہیں میں اُس کا مشاہدہ بھی اپنی آنکھوں سے کروں۔ میں اپارٹمنٹ واپس جا کر چند گھنٹے سونا چاہتا تھا تاہم پاول کے اصرار پر ہمیں گورکی پارک جاتے ہی بنی۔ بالشوئی تھیٹر سے گورکی پارک پہنچتے رات کے سوا دس بج گئے۔ لیکن ایک کمال یہ ہوا کہ پارک کے علاقے میں ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی۔ مجھے پارک میں نہ جانے کا بہانہ مل گیا۔ اگرچہ پارک کے باہر کیوبن موسیقی کی دھنیں اور نوجوان رُوسی لڑکوں لڑکیوں کا شور اُمڈا چلا آتا تھا میں نے بوندا باندی میں بھیگنے سے انکار کر دیا۔ میرے انکار سے پاول کو تھوڑی مایوسی ہوئی۔ اس نے ادھر ادھر کوئی دوکان ڈھونڈنے کو کوشش کی جہاں سے میرے لئے چھتری مل جائے لیکن اِس وقت کوئی دوکان کھلی نہیں تھی۔ پاول کی عادت تھی کہ وہ ہر وقت گاڑی کی ڈگی میں دو تین چھتریاں رکھتا تھا لیکن اتفاق سے اِس وقت اُس کی گاڑی کی ڈگی میں بھی کوئی چھتری نہیں تھی۔ چنانچہ اُس نے بادلِ نخواستہ گاڑی اسٹارٹ کی اور ہم اپارٹمنٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔

رُوس میں روڈ سسٹم اچھا ہے لیکن اتنا اچھا بھی نہیں ہے۔ سوویت یونین کے زمانے میں رُوسیوں نے اندرون وبیرون شہر سفر کے لئے جو سسٹم تعمیر کیا تھا اُس میں ٹرینوں پر زیادہ انحصار کیا گیا تھا۔ اِس لئے انہوں نے روڈ سسٹم پر کم توجہ دی۔

اب سوویت یونین ٹوٹنے کے بعد جب ہر نوع کی گاڑیاں پوری دنیا کے کار بنانے والوں کی طرف سے رُوسی مارکیٹ میں دھڑا دھڑ فروخت کی جارہی ہیں تو اُنہیں یقیناً ایک نئے روڈ سسٹم کی ضرورت ہے۔ سنا ہے کہ کچھ بین الاقوامی پرائیوٹ انویسٹرز انٹر سٹی سفر کے لئے رُوس کے اندر فری ویز بنانے جارہے ہیں جن کے بارے میں رُوسی شہریوں کو پہلے ہی یہ باور کرایا جارہا ہے کہ اِن فری ویز کا استعمال مفت نہیں ہو گا۔ اِنہیں استعمال کرنے کے لئے اُنہیں قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ جس سے رُوسی خاصے ناراض دکھائی دیتے ہیں۔ فری ویز کے استعمال کے لئے قیمت ادا کرنے کا تصور اُن کے لئے نیا ہے۔ جس کا عادی ہونے میں شاید اُنہیں کچھ وقت لگے۔

رُوسیوں کی اِس نظام پر ناراضی بجا ہے لیکن اب وہاں بھی جمہوریت آرہی ہے۔ سامراجی گماشتوں کے ذریعے جیسی جمہوریت آتی ہے اُس کی اپنی ایک شکل اور اُس کے اپنے تقاضے ہیں۔ دیگر سرمادارانہ گاہک ریاستوں کی طرح رُوس میں اگر یہ سلسلہ اِسی طرح چلتا رہا تو اُس سے یا رُوس مکمل طور پر ڈوب جائے گا یا ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ ممالک کی طرح ایک ترقی یافتہ ملک بن جائے گا۔

ہم گورکی پارک سے ہلکی ہلکی بوندا باندی میں گاڑی چلاتے جب پاول کے اپارٹمنٹ پہنچے تو رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ اب نہ سونے کا ٹائم تھا نہ جاگنے کا کیونکہ ہمیں دو بجے صبح اُٹھ کر ائیرپورٹ کے لئے تیار ہونا تھا۔

اس لئے ہم جلدی سے بستروں میں گھس گئے لیکن اس سے پہلے کہ نیند ہم پر مکمل غلبہ پا لیتی اور ہم بھول جاتے کہ ہمیں ائیر پورٹ جانا ہے ہم تینوں صبح دو بجے بستروں سے اُٹھے، نہا دھو کر کپڑے بدلے، سامان اٹھایا اور ائیر پورٹ کی طرف چل دیئے۔

پاول نے اور ہم نے جس طرح سات دن ایک دوسرے کے ساتھ گزارے تھے اِس کا اُس پر اور ہم پر ایک جذباتی اثر تھا۔

ہم نے اُسے کہا کہ وہ ہمیں ائیر پورٹ پر اُتار کر چلا جائے لیکن وہ نہ مانا۔ اُس نے ہمیں ائیر پورٹ پر اُتارا اور خود گاڑی پارک کرنے چلا گیا۔ ہم ابھی بورڈنگ پاس حاصل کرنے والے لائن میں کھڑے تھے کہ وہ گاڑی پارکنگ لاٹ میں پار کر کے ائیر پورٹ کے اندر چلا آیا۔ ابھی بورڈنگ پاس جاری کرنے والی کلرک ڈیسک پر نہیں پہنچی تھی۔ چنانچہ جب تک ہم بورڈنگ پاس لینے والی لائن میں کھڑے رہے وہ ہمارے ساتھ کھڑا رہا۔ بورڈنگ پاس لے کر ہم روانگی والے لاؤنج کے اندر جانے لگے تو رُندھی ہوئی آواز میں بولا۔ روس واپس ضرور آنا اور جلد آنا۔ میں نے اُسے چھیڑنے کے لئے کہا ہاں سوویت یونین اچھا تھا ہم ضرور واپس لوٹیں گے۔ اُس نے اپنی مخصوص انگریزی میں جواب دیا نہیں رُوس اچھا ہے۔ یہ کہہ کر وہ اپنے چہرے پر مسکراہٹ سجائے ہاتھ ہلاتا ائیر پورٹ کے بیرونی حصے کی طرف چل دیا۔

امریکہ واپسی

پاول کو خدا حافظ کہتے ہوئے میرا دل بھی بھر آیا۔ اُس کے ساتھ چھ سات دن اتنے اچھے گزرے تھے کہ میں چاہوں بھی تو اُسے زندگی بھر نہیں بھلا پاوں گا۔ اُسے خدا حافظ کہتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ کیا دنیا میں ابھی تک اتنے اچھے انسان بھی موجود ہیں۔ پاول کا کسی مذہب کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ اُس نے اخلاقیات کی کوئی مذہبی کتاب نہیں پڑھی تھی۔ لیکن وہ انسانیت کا ایک اچھا نمونہ تھا۔ اتنا اچھا نمونہ کہ اُس جیسا بننے کو جی چاہے۔

پاول کو خدا حافظ کہہ کر ہم سیکورٹی میں سے گزرے تو وہاں بھی اسکینگ والی امریکی مشین نصب تھی۔ مشین میں سے گزرتے ہوئے میرا ذہن 9/11 کے واقعات کی طرف چلا گیا۔ جس کے نتیجے میں دنیا بھر میں باقاعدہ ایک سیکورٹی انڈسٹری نے جنم لیا ہے۔ جس انڈسٹری میں دنیا بھر میں لاکھوں لوگ مختلف حیثیتوں میں ملازمتیں کر رہے ہیں۔

سیکورٹی کے آلات بنانے والی کمپنیاں۔ کمپنیوں کی مینجمنٹ اور کارندے۔ پھر یہ مشینیں جن میں سے گزرتے وقت کسی کمرے میں بیٹھا کوئی فرد ہر مسافر کو بغیر کپڑوں کے دیکھتا ہے۔

میرے رُوس آنے سے چند ماہ پہلے امریکہ میں سین ہاوزے انٹرنیشنل ائیر پورٹ پر اِس مشین میں سے گزرنے سے پہلے سیکورٹی کی لائن میں لگے ایک شخص نے احتجاجاً اپنے سارے کپڑے اتار دیئے تھے۔ اُس کا کہنا تھا کہ اگر کسی کمرے میں بیٹھے کسی شخص نے مجھے ننگا دیکھنا ہے تو بہتر ہے ساری دنیا مجھے ننگا دیکھ لے۔ سیکورٹی والوں نے اُسے گرفتار کر لیا اور لے جا کر جج کے سامنے پیش کر دیا۔ جج نے اُسے پبلک میں

کپڑے اُتا کر ننگا ہونے کی وجہ پوچھی تو اُس نے جج کو بتایا کہ اُس نے اُس بیہودگی کے خلاف احتجاج کیا ہے جس سے اُس کو اِس مشین میں سے گزرتے ہوئے گزرنا پڑتا ہے۔ جج نے احتجاج کو اُس کا بنیادی حق قرار دے کر اُسے چھوڑ دیا۔

مشین میں داخل ہوتے ہوئے یہ سوچیں میرے ذہن میں گرداں تھیں۔ انہی سوچوں میں گم میں مشین میں کھڑا تھا اور باہر بیٹھا سیکورٹی افسر رُوسی میں چلاّئے جارہا تھا۔ میں نے اُس کے چلاّنے کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ جب میں نے اُس کے چلاّنے کی طرف توجہ نہ دی تو وہ اُٹھ کر میرے پاس آیا اور میری بیلٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رُوسی میں بولا مجھے یہ بیلٹ اتارنی چاہئے تھی۔

میں نے اُس کے کہنے پر مشین سے واپس نکل کر بیلٹ اتار کر دوسری مشین کی بیلٹ پر رکھی اور دوبارہ اسکیننگ مشین میں جا کر کھڑا ہو گیا۔

اُس نے سر کے اشارے سے اوکے کیا تو میں مشین سے آگے بڑھ گیا۔ دوسری طرف علی اپنا اور میرا سامان سنبھال رہا تھا۔ ہم اپنا سامان اٹھا کر گیٹ پر چلے گئے۔ ہماری فلائٹ پہلے ماسکو سے جنیوا جارہی تھی۔ جنیوا سے علی کو نیو یارک کی فلائٹ پکڑنا تھی جب کہ مجھے واشنگٹن جانا تھا۔ علی کی اگلی فلائٹ میں مشکل سے ایک گھنٹے کا وقفہ تھا لیکن میرا جنیوا میں کوئی ڈھائی گھنٹے کا قیام تھا۔

اِتفاق سے جنیوا ائیر پورٹ سے میری اور علی کی فلائٹ کی ایک ہی گیٹ سے روانہ ہونا تھی۔ اِس لئے ہم جہاز سے اُترتے ہی تیز تیز قدم اُٹھاتے اپنے مطلوبہ گیٹ کی طرف روانہ ہوئے۔ بدقسمتی سے فلائٹ کے اگلے حصہ کے لئے بورڈنگ پاس نہ ہونے کی وجہ سے جنیوا کی سیکورٹی نے ہمیں باہر والے کاؤنٹر پر جانے کے لئے کہا۔

مرتے کیانہ کرتے ہم سیکورٹی سے باہر نکل کر بیرونی کاؤنٹر پر پہنچے اور جنیوا سے اپنی فلائٹوں کے بورڈنگ پاس حاصل کئے۔ کاؤنٹر کلرک نے کمال مہربانی سے ہمیں سیکورٹی میں سے گزرنے کے لئے ایک اسپیشل دروازہ دکھایا جہاں کوئی اور نہیں تھا۔ اُس کی ہدایات کے مطابق ہم نے اُس دروازے کا بٹن دبایا تو دروازہ کھل گیا۔ جہاں ہم لائن میں لگے بغیر سیکورٹی مشینوں سے گزر کر گیٹ پر چلے گئے۔ جلدی جلدی قدم اُٹھاتے گیٹ تک پہنچے تو علی کی فلائٹ روانگی کی لئے تیار تھی۔ چنانچہ وہ بغیر رُکے سیدھا جہاز پر چلا گیا جب کہ میں نے گیٹ کے انتظار والے حصے میں بیٹھ کر اپنا لیپ ٹاپ آن کیا اور انٹرنیٹ کی سیاحت شروع کردی۔

علی کے جہاز کی روانگی کے بعد اُسی گیٹ پر دوسرا جہاز آن کھڑا ہوا۔ ہم کوئی گھنٹہ ڈیڑھ وہاں بیٹھے ہوں گے کہ واشنگٹن والی فلائٹ کی بورڈنگ شروع ہوگئی۔ میں نے کمپیوٹر بند کیا اور جہاز پر سوار ہونے والی لائن میں جا کھڑا ہوا۔

لائن میں زیادہ تر امریکی تھے جو یورپ کے مختلف ملکوں سے یہاں پہنچے تھے اور اب گھر واپس جا رہے تھے۔ کچھ یورپی امریکی تھی جو اپنے سابقہ وطنوں کی سیاحت کے بعد امریکہ لوٹ رہے تھے۔ اُس گیٹ پر بھی سیکورٹی والے اپنے پسند کے مسافروں کو دوبارہ چیک کر رہے تھے۔ یہاں سیکورٹی والوں نے مجھ سے کوئی تعرض نہ کیا۔ چنانچہ میں سیدھا جا کر جہاز میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد جہاز نے جنیوا کی زمین کو خدا حافظ کہا تو جہاز کے چاک و چوبند عملے نے مسافروں کی آؤ بھگت شروع کر دی۔ تھوڑی دیر کے لئے جہاز فضا میں ایک پر رونق مقام میں ڈھل گیا۔ جہاں بیٹھے لوگ اپنی پسند کے مشروبات سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ مشروبات کے دوران ہی عملے نے مسافروں کو کھانا پیش کیا۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں لوگ کھانے

پینے سے فارغ ہوئے تو جہاز کے عملے نے بچا کھچا سامان اُٹھایا اور جہاز کی لائٹیں بند کر دیں۔ زیادہ تر مسافروں نے اپنی سیٹیں دراز کیں اور اُن پر لیٹ کر اپنے جسموں اور چہروں پر کمبل کھینچ لئے۔

میں نے سونے کی بجائے جہاز کے پلگ میں وائر لگا کر اپنا کمپیوٹر آن کیا اور اپنے سفر نامے کے نوٹس پھیلانے میں مصروف ہو گیا۔

جب جہاز جنیوا سے روانہ ہوا تھا تو جہاز کے اناؤنسمنٹ سسٹم پر مسافروں کو خوش آمدید کہنے والی ائیر ہوسٹس نے اپنا نام لیلیٰ بتایا تھا۔ اُس کا نام سُن کر میں کچھ چونکا تھا۔ میں نے پہلی بار ایک امریکی ائیر لائن کی بین الاقوامی پرواز پر لیلیٰ نام کی ائیر ہوسٹس دیکھی تھی۔ لیلی کا نام سن کر اور اُس کی شکل دیکھ کر مجھے لگا کہ اُس کا مڈل ایسٹ سے تعلق ہے۔

دورانِ پرواز میں سیٹ سے اُٹھ کر ریسٹ روم گیا تو لیلیٰ نے اپنے کیبن کے پاس مجھے روک لیا۔ کہنے لگی کیا میں اپنے کمپیوٹر پر عربی لکھ رہا ہوں۔ اگر کوئی گوری امریکی ائیر ہوسٹس یہ سوال کرتی تو شاید میں کچھ ہچکچاہٹ کا شکار ہوتا۔ لیکن لیلیٰ کے اِس سوال پر مجھے کوئی ہچکچاہٹ نہ ہوئی۔ میں نے کہا نہیں میں کمپیوٹر پر عربی نہیں اُردو لکھ رہا ہوں۔ دونوں زبانوں کے حروفِ ابجد ملتے جلتے ہیں۔ اِس لئے اُسے اِس پر عربی کا گمان ہوا ہے۔

گفتگو جاری رکھنے کے لئے لیلیٰ نے مجھے پوچھا کیا میں مسلمان ہوں۔ میں نے ہاں میں جواب دیا تو اُس نے مجھے بتایا کہ اُس کا باپ لبنانی مسلمان ہے جب کہ اُس کی ماں کیتھولک امریکن گوری ہے۔ اُس نے مجھے بتایا کہ اُس کے ماں باپ اب بہت بوڑھے ہیں اور دونوں ایک ساتھ نیویارک میں رہتے ہیں۔ اب بھی دونوں اپنے اپنے عقیدے پر قائم ہیں۔

میں نے اُس سے اُس کے عقیدے کے بارے میں پوچھا۔ اُس نے کہا وہ اپنے بچوں کے ساتھ کبھی مسجد جاتی ہے اور کبھی چرچ۔ اُس کا خاوند لا مذہب ہے لیکن وہ اُنہیں نہ مسجد جانے سے روکتا ہے نہ چرچ جانے سے۔

خوبصورت لیلیٰ کی خوبصورت باتیں مجھے اچھی لگیں۔ اُس نے کہا سب مسافر سیٹوں پر دراز سو رہے ہیں۔ مجھے بھی اپنی سیٹ پر لیٹ کر سونے کی کوشش کرنا چاہیئے۔

میں نے لیلیٰ کو بتایا کہ جب میں واشنگٹن سے سان فرانسسکو پہنچوں گا تو وہاں شام کے آٹھ بجے ہوں گے۔ اگر میں جہاز میں سویا رہا تو گھر پہنچ کر رات بھر جاگتا رہوں گا۔ اِس لئے اِس فرصت کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے جہاز میں جاگ کر اپنا کام کرنا بہتر سمجھتا ہوں۔

لیلیٰ نے بات جاری رکھتے ہوئے مجھے پوچھا کہ میں اُردو میں کیا لکھ رہا ہوں۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں رُوس سے آرہا ہوں۔ وہاں میں نے اپنی سیاحت کے دوران نوٹس لئے تھے۔ اب میں اُن کو سفر نامے کی صورت دے رہا ہوں۔ لیلیٰ نے کہا کیا اِس سفر نامے میں ہماری ائیر لائن کا ذکر بھی آئے گا۔ میں نے کہا ہاں۔ اِس میں تمہاری ائیر لائن کا ذکر آئے گا اور ساتھ ہی اب تمہارا ذکر بھی ہو گا۔

میرا جواب سُن کر اُس کے چہرے پر ایک بہت ہی دلآویز مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی: "میری خیر ہے لیکن اپنے سفر نامے میں میری ائیر لائن کے بارے میں اچھی اچھی باتیں لکھنا۔" میں نے جواب دیا میں ہوائی سفر کے لئے یونائٹیڈ ائیر لائن بہت زیادہ استعمال کر تا ہوں۔ اور مجھے اس ائیر لائن سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ وہ میرا جواب سُن کر مطمئن ہو گئی۔

لیلیٰ کے ساتھ جنیوا سے واشنگٹن تک کا سفر بہت اچھا گزرا۔ اُس نے دورانِ سفر میرا بہت خیال رکھا۔ میں خوش تھا کہ لیلیٰ اِس ماحول میں ایک امریکی ائیر لائن کے لئے کام کر رہی ہے۔ میری خواہش ہے کہ

امریکہ اور یورپ میں قیام پذیر مسلمان لڑکیاں زیادہ سے زیادہ تعداد میں امریکی اور یورپی ایئر لائنوں میں بطور ائیر ہوسٹس کام کریں۔ اِس سے یورپ اور امریکہ میں قیام پذیر مسلمانوں اور یورپ اور امریکہ کے مقامی باشندوں میں اعتماد کی فضا پیدا کرنے میں بہت مدد ملے گی۔ کم از کم جو مسلمان بچے اور بچیاں ان ممالک میں پیدا ہوئے ہیں اور اُنہوں نے اِن اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم پائی ہے اُن کے لئے ائیر لائنوں میں ایسی ملازمتیں کرنا مشکل نہیں ہونا چاہئے۔

جنیوا سے ساڑھے آٹھ گھنٹے میں فلائٹ واشنگٹن پہنچ گئی۔ جہاز ڈلس ایئر پورٹ پر اُترا تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اگرچہ ابھی مجھے واشنگٹن سے جہاز پکڑ کر سان فرانسسکو جانا تھا۔ لیکن مجھے لگا میں اپنے ملک واپس پہنچ گیا ہوں۔

جہاز سے اُتر کر تیز تیز قدم اٹھاتا میں امیگریشن کاؤنٹر پر پہنچا تو وہاں تا حال بہت کم مسافر تھے۔ ابھی تک زیادہ تر کاؤنٹر خالی تھے۔ ایک لڑکی نے ایک کاؤنٹر کی طرف میری راہنمائی کی۔ امیگریشن افسر نے میرا پاسپورٹ دیکھ کر کہا: "کیا میں نے پہلی بار رُوس کا سفر کیا ہے؟" میں نے کہا: "ہاں۔" اُس نے پوچھا مجھے رُوس کیسا لگا؟ میں نے جواب دیا: "بہت اچھا۔" اُس نے کہا "ویلکم ہوم" اور پاسپورٹ اسٹیمپ کر کے میرے حوالے کر دیا۔ میں کسٹم ایریئے سے ہوتا ہوا سان فرانسسکو جانے والے جہاز کے گیٹ کی طرف چل دیا۔

ایک گھنٹے بعد میں سان فرانسسکو جانے والے جہاز پر بیٹھا سان فرانسسکو کی طرف محوِ پرواز تھا۔ لیکن اِس فلائٹ پر لیلیٰ نہیں ایک ادھیڑ عمر کا گورا امریکی اور قدرے ایک معمر امریکن گوری ہمارے لئے ائیر ہوسٹس کے فرائض سر انجام دے رہے تھے۔ وہ دونوں بھی بھاگ دوڑ کر مسافروں کی خدمت کر رہے تھے لیکن اُن میں لیلیٰ والی بات نہیں تھی۔

جہاز وقت سے آدھ گھنٹہ پہلے سان فرانسسکو کے ائیر پورٹ پر لینڈ ہوا تو سان فرانسسکو کی ہلکی خنک ہوا نے مجھے واپس اپنے گھر آنے پر خوش آمدید کہا۔ سان فرانسسکو کی ہوا اپنے پھیپھڑوں میں بھرتے ہوئے مجھے ایک فرحت اور تازگی کا احساس ہوا۔ اگرچہ ماسکو سے سان فرانسسکو تک کا سفر بہت طویل اور تھکا دینے والا تھا لیکن اس کے باوجود میرا دل ایک بے پایاں مسرت سے بھرا ہوا تھا کہ میں دنیا کے ایک ایسے ملک کی سیاحت سے واپس آ رہا تھا جس نے دنیا کی تاریخ میں ستر برس تک ایک انتہائی اہم کردار ادا کیا تھا۔ جسے دیکھنے کی تمنا ہمیشہ سے میرے دل میں تھی اور میں اس خواہش کی تکمیل سے واپس اپنے گھر لوٹا تھا۔

* * * * *

کچھ مصنف کے بارے میں

خواجہ اشرف 1951 میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ 1971 میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کے بعد پہلے مختصر عرصہ کے لیے اسلام آباد میں پریذیڈنٹ سیکریٹریٹ میں کام کیا۔ پھر پنجاب پبلک سروس کمشن سے انتخاب کے بعد پنجاب میں محکمۂ تعلیم سے وابستہ ہوئے اور پنجاب کے مختلف کالجوں میں بطورِ لیکچرار پڑھاتے رہے۔

لکھنے پڑھنے کا شوق بچپن سے تھا۔ دورانِ تعلیم پاکستان کے مختلف اخبارات میں کے ایم اشرف کے نام سے سیاسی، سماجی اور ادبی موضوعات پر مضامین لکھے۔

پاکستان میں وزیر آغا کی ادارت میں شائع ہونے والے ادبی میگزین اوراق اور ہندوستان میں شمس الرحمٰن فاروقی کی ادارت میں شائع ہونے والے ادبی میگزین شب خون میں کئی کہانیاں اور انشائیے لکھے۔

جنرل ضیا الحق کے مارشل لاء کے بعد 1981 میں امریکہ چلے گئے۔ امریکہ میں یونیورسٹی آف فینکس سے ایم بی اے کرنے کے بعد کاروباری دنیا سے وابستگی اختیار کی۔

امریکہ منتقلی کے بعد ضیا دور میں مختلف بین الاقوامی فورمز پر پاکستان میں بحالی جمہوریت کے لیے بھرپور جدوجہد کی۔ یہ جدوجہد مشرف دور میں بھی جاری رہی۔ اب بھی پاکستان میں جمہوریت کی نشوونما اور ترویج واشاعت سے خاص دلچسپی ہے۔

ادب میں ترقی پسند رجحانات کی طرف جھکاؤ ہے۔ زیرِ نظر سفرنامے "ماسکوماسکو" کے علاوہ تین اور سفرناموں "اسرائیل میں چند روز"، "کنارِ نیل" اور "سقراط کے شہر میں" اور تین ناولوں "مٹی کا بیٹا"، "نسلِ سوختہ" اور "شب گزیدہ سحر" اور کہانیوں کے تین مجموعوں "آئینہ کہانی" اور "مکالمے کا قتل"

اور "تاریکی میں چلتے لوگ" اور نثری نظموں کی ایک کتاب "برف میں کھلا پھول" کے مصنف ہیں۔ تا حال لکھنے کا سلسلہ جاری ہے۔

مصنف کی دیگر کتابیں

مٹی کا بیٹا۔۔۔ناول

ایک اچھوتی اور دلچسپ کہانی جو پاکستان کے چھوٹے سے گاؤں سے شروع ہو کر امریکہ سے ہوتی ہوئی اُسی گاؤں میں ختم ہوتی ہے۔ کہانی کا ہیرو ساری عمر اپنے طبعی والد کی تلاش میں کئی دلچسپ مرحلوں سے گزرتا ہے۔ انسانی جذبوں کی عظیم داستان جو انسان دوستی اور انسانی مساوات کا درس دیتی ہے۔ تشدد اور جنگ سے بچنے کا سبق سکھاتی ہے۔ زندگی کے احترام کی تلقین کرتی ہے۔

نسلِ سوختہ۔۔ناول

1947 میں پاکستان بننے سے لیکر 1971 میں قائداعظم محمد علی جناح کے پاکستان ٹوٹنے کی کہانی۔ پاکستانی سیاست کی بائیبل جس میں اُن کوتاہیوں کی نشاندہی کی گئی ہے جن کی وجہ سے 1971 میں قائداعظم محمد علی جناح کا پاکستان دولخت ہُوا۔ پاکستان کی مخصوص صورت حال کے پیش نظر پاکستان کے سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل کے ممکنہ حل پیش کرتی ہے۔ پاکستانی سیاست میں دلچسپی رکھنے والے کسی بھی شخص کے لئے اس ناول کا مطالعہ از حد ضروری ہے۔ اس کا مطالعہ اُنہیں پاکستان کو ایک نئے پس منظر میں دیکھنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔

شب گزیدہ سحر۔۔ناول

شب گزیدہ سحر روسی انقلاب کے بعد سوویت یونین کی تشکیل سے لے کر تحلیل تک کی کہانی ہے جو ایک رومانی داستان کے ذریعے نہ صرف انقلاب کی کہانی سناتی ہے بلکہ سوویت یونین کے عروج و زوال اور

آخرِ کار تحلیل کے پس پردہ عوامل اور کرداروں کی نشاندہی کرتی ہے۔ یہ ناول اپنے قارئین کو سوویت یونین کے بارے میں ایک نیا پس منظر پیش کرتا ہے۔ خاص طور پر انقلابی کارکن اس ناول کو پڑھ کر انقلاب کے لئے اپنی جدوجہد میں ممکنہ غلطیوں سے خود کو اور تحریک کو محفوظ رکھ سکتے ہیں۔

آئینہ کہانی۔۔۔ کہانیوں کا مجموعہ

آئینہ کہانی میں مصنف کے قلم سے لکھی گئی چھبیس انوکھی اور دلچسپ کہانیاں شامل ہیں۔ ان میں سے ہر کہانی زندگی کے کسی نہ کسی انوکھے رُخ کی نشاندہی کرتی ہے جسے پڑھ کر انسان بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

مکالمے کا قتل۔۔۔ کہانیوں کا مجموعہ

مکالمے کا قتل مصنف کے قلم سے لکھی گئی پچیس مزید کہانیوں کا مجموعہ جن میں مصنف نے انوکھے موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے۔ اِن کہانیوں میں مصنف کا دیگر لکھاریوں سے ہٹ کر چیزوں کو دیکھنے کا عمل اُسے ایک طرف اپنے ہم عصر لکھاریوں سے ممتاز کرتا ہے اور دوسری طرف قارین کو ان موضوعات کو مکمل طور پر مختلف زاویوں سے نظر ڈالنے کی دعوت دیتا ہے۔ قاری سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ زندگی کو ایسے زاویوں سے بھی دیکھا جا سکتا ہے لیکن آج تک وہ ایسا کیوں نہیں کر سکا۔

تاریکی میں چلتے لوگ۔۔۔ کہانیوں کا مجموعہ

تاریکی میں چلتے لوگ مصنف کے قلم سے لکھی گئی چھبیس کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ کہانیوں کے موضوعات ہمارے عہد کے شعوری تضادات کو اتنی خوبصورتی سے اپنے گرفت میں لیتے ہیں کہ قاری انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔ کہانیوں کی کنسٹرکشن اتنے فن کارانہ انداز میں کی گئی ہے کہ مصنف اردو کہانی

نگاروں سے سے اُٹھ کر بین الاقوامی کہانی نگاروں کی صف میں شامل ہو جاتا ہے۔ ایک نقاد کا کہنا ہے کہ تاریکی میں چلتے لوگ کی کہانیاں اُسے سعادت حسن منٹو اور ٹیگور کی کہانیوں کی یاد دلاتی ہیں۔

اسرائیل میں چند روز۔۔۔ سفر نامہ

اسرائیل میں چند روز میں مصنف نے اسرائیل میں گزارے چند دنوں کی کہانی اتنی خوبصورتی اور مہارت سے بیان کی ہے کہ قاری محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک ایک پل مصنف کے ساتھ اسرائیل کا سفر کر رہا ہے۔ اس سفر نامہ میں یروشلم سے تعلق رکھنے والے پیغمبروں کے سبھی مقبروں کی کلر تصاویر کے ساتھ ساتھ اُن کی زندگیوں کے منفرد واقعات شامل ہیں جو آپ کو کسی اور کتاب میں نہیں ملیں گے۔ کتاب میں اسرائیل کے معرض وجود میں آنے سے لے کر آج تک کی صورت حال پر بصیرت افروز معلومات کی تفصیل درج ہے۔

کنارِ نیل۔۔۔ سفر نامہ

مصنف نے 2012 میں کئے گئے اپنے مصر کے سفر کی داستان اتنی خوبصورتی اور مہارت سے تحریر کی ہے کہ قاری سارے سفر میں مصنف کے ساتھ سفر کرتا ہے۔ اس سفر میں جہاں قاری مصنف کی آنکھوں سے مصر دیکھتا ہے وہاں مصر کی تاریخ، جغرافیہ اور ثقافتی لینڈ اسکیپ سے بھی مکمل آگاہی حاصل کرتا ہے۔

سقراط کے شہر میں۔۔۔ سفر نامہ

جون 2012 میں مصنف کو ایک ہفتہ یونان میں گزارنے کا اتفاق ہوا۔ زیادہ تر وقت شہر سقراط ایتھنز کی گلیوں میں گھومتے پھرتے گزرا۔ اس کے علاوہ بحر ایجین میں تین اہم جزیروں کی سیاحت کا موقع بھی ملا۔

"سقراط کے شہر میں" اِسی سفر کی ایک دلچسپ داستان ہے۔ اس معلوماتی سفر نامے میں یونان کی تاریخ اور ثقافت کا انتہائی خوبصورت اور دلکش جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

برف میں کھلا پھول۔۔۔ نثری نظمیں

برف میں کھلا مصنف کا ۷۵ نثری نظموں پر مشتمل مجموعہ ہے جنہیں پڑھ کر قاری حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ نثری نظم میں بھی ایسے شاعرانہ امیجز تراشے جاسکتے ہیں جنہیں پڑھ کر انسان وہی حظ اٹھاتا ہے جو کبھی روائیتی شاعری کا طرہ امتیاز تھا۔

کتاب خریدنے کے لیے مندرجہ ذیل ای میل پر رابطہ کریں:

Email: kashraf@ix.netcom.com